

ہندستان کی پہلی ہسلائی تحریک

یعنی

حضرت سید شہیدؒ اور ان کے ماننے والوں کی چلائی ہوئی تحریک
تجدید و جہاد کی تاریخ اور ان کے کارناموں پر تبصرہ اور تنقید نیز
غیروں کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشاندہی اور تردید
(تالیف)

مستعود عالم ندوی

ناشر

مکتبہ نیشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

عینا سی



(جملہ حقوق محفوظ)

تیسری اشاعت (برائے بھارت) ۱۱۰۰

ملنے کا پتہ

بھارت میں :- مکتبہ نشاد ثانیہ معظم جاہی مارکٹ حیدر آباد دکن
پاکستان میں :- مکتبہ چراغ راہ آرام باغ روڈ - کراچی -

(مطبوعہ)

مرتضیٰ پریس رام پور

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ



TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

فہرست مضامین

مضمون

نمبر شمار

صفحہ

۱	دیباچہ طبع دوم	۸ تا ۶
۲	عرض مؤلف	۹
۳	پہلا باب - وہابیت کیا ہے؟	۱۶
۴	دوسرا باب - بدنام وہابی	۲۰
۵	ہندوستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور نجد کی دعوت توحید و اصلاح کا فرق	۲۱
۶	وہابی اور اہل حدیث	۲۸
۷	تیسرا باب - سید احمد شہیدؒ ۱۲۷۶ھ تا ۱۲۷۹ھ	۳۱
۸	جہاد	۳۶
۹	دعوت اور مشن	۴۰
۱۰	دعوت کا اہم عنصر	۴۴
۱۱	شہادت یا غیبت	۴۸
۱۲	اصلی نصب العین و تاسیس حکومت الہیہ	۵۰
۱۳	مشہور خلفاء	۵۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۴	چوتھا باب - سید صاحب کے بعد	
۱۵	مولانا ولایت علی صادق پوریؒ	۵۵
۱۶	تنظیم و تبلیغ	۶۰
۱۷	حج و جہاد	۶۲
۱۸	مولانا عنایت علی غازیؒ	۶۷
۱۹	تبلیغ	۶۸
۲۰	فصل خصوصیات	۷۰
۲۱	جہاد	۷۱
۲۲	غداروں پر اعتماد	۷۵
۲۳	چھتر چھار ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۷ء	۷۷
۲۴	آخری ابتلاء ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء	۷۹
۲۵	مختلف امراء	۸۲
۲۶	مولانا عبد اللہ صادق پوریؒ	۹۲
۲۷	پانچواں باب - ہندوستان کے اندر	۱۱۲
۲۸	نظام عمل	۱۱۹
۲۹	فرہنگ مصطلحات	۱۳۱

صفحہ	مضمین	نمبر شمار
۱۳۵	چھٹا باب - سازش کا الزام اور مقدمے	۳۰
۱۳۷	پہلا مقدمہ سازش : اثبات ۱۸۶۴ء	۳۱
۱۴۹	دوسرا مقدمہ سازش : پٹنہ ۱۸۶۵ء	۳۲
۱۶۲	تیسرا مقدمہ سازش : مالده ۱۸۶۶ء	۳۳
	ضلع مالده	۳۴
۱۶۴	چوتھا مقدمہ سازش و راج محل ۱۸۶۷ء	۳۵
۱۶۷	پانچواں مقدمہ سازش : پٹنہ ۱۸۶۸ء	۳۶
۱۸۰	بعض دوسرے گرفتارانِ بلا	۳۷
۱۸۳	ساتواں باب - اسیرانِ بلا کے مصائب اور ان کی استقامت	۳۸
	آٹھواں باب - ظاہری ناکامی کے اسباب	۳۹
۲۰۰	کامیابی یا ناکامی	۴۰

۲۱۱	کتابیات	۴۱
	فارسی	۴۲
۲۱۲	اُردو	۴۳
	انگریزی	۴۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک کی یہ تیسری اشاعت ہے۔ دوسرے اڈیشن میں گو کافی تصحیح و تنقیح کی گئی تھی، پھر بھی تحقیق کے بعض گوشے اوجھل رہ گئے اور ایک مزید منقح اڈیشن کی ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی ہے۔ مگر حالات اور مشغولیتیں اس طرف توجہ کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ مجبوری میں اس تیسری اشاعت کے موقع پر صرف جزوی ترمیم و اضافہ پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر زندگی باقی رہی اور حالات نے سازگاری کی، تو اگلے اڈیشن میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

دارالعلوم - راولپنڈی
۳۰ رجب ۱۴۱۰ھ

عاجز
مسعود عالم ندوی

دوسرا چہرہ طبع دوم

آج سے تقریباً ایک برس پہلے یہ کتاب شائع ہوئی تھی اور اس حال میں کہ کتابت و طباعت کی غلطیوں کی زیادتی کے باعث غریب ثلوف کو ایک مغرر نامہ بھی لکھنا پڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تمام ظاہری و باطنی کوتاہیوں کے باوجود کتاب قبولیت کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔ اور خواص و عوام ہر طبقے میں اس کا خیر مقدم ہوا۔

راقم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ موضوع ابھی بڑی محنت اور تلاش و جستجو کا طالب ہے۔ بد نصیبی سے ان سطروں کا لکھنے والا صحت اور سکون خاطر، دونوں نعمتوں سے

محروم ہے۔ جو کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھے ہیں، انہیں سے عہدہ برآہوں مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی عاجز نے کوشش کی ہے کہ اس دوسرے اڈیشن میں پہلی کتابیاں نہ رہیں تفصیل کی جگہ ضروری تفصیل کر دی جائے۔ جو مقام تشنہ رہ گئے تھے انہیں مکمل کر دیا جائے۔ اور غیر ضروری نہیں اور حوالے جو حقیقی کامیوں کی خصوصیت ہیں، حذف کر دیئے جائیں۔ اِملاء، اور کتابت میں بھی قواعد کا لحاظ رکھا جائے۔ اور اوقاف کی صحت کا بھی التزام کیا جائے۔ — نہیں کہہ سکتا کہ عاجز ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ بہر حال اگر کوئی خوش گوار تبدیلی اور مفید اضافہ محسوس ہو، تو یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر محمول کیا جائے ورنہ مؤلف کی کوتاہی سمجھ کر عفو و درگزر سے کام لیا جائے۔

موضوع کی اہمیت اور ذرائع علم کی کمی کے باعث، حقیر مؤلف نے اہل نظر سے درخواست کی تھی کہ وہ مفید مشوروں سے سرفراز فرمائیں۔ مگر افسوس کہ اس باب میں بالکل مایوسی ہوئی۔ رسالوں اور اخباروں کے تبصرے عام طور پر اچھے اور حوصلہ افزا تھے۔ لیکن علمی مشورہ کی تلاش ان میں بے سود گئی۔ بعض احباب نے لہجے کی تلخی کی شکایت کی ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ مصنف میں ندویت کے ساتھ ساتھ نجدیت بھی ہے۔“

راقم نے پوری کتاب ٹھنڈے دل کے ساتھ دوبارہ پڑھی۔ اور جہاں کہیں واقعی کوئی تلخ فقرہ نظر آیا، اسے حذف کر دینے میں تامل نہیں ہوا۔ لیکن ان احباب کی شکایت شاید اب بھی باقی رہ جائے، اس لئے کہ ماطل کہ

حق کہنا یا اس کے مقابلے میں مدارات و مدار ہمت سے کام لینا راقم کے بس سے باہر ہے۔

ذاتی طور پر بھی راقم نے متعدد ارباب علم سے مشورہ کی درخواست کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ان میں اگر کوئی مشتعلی مثال ہے، تو وہ جناب غلام رسول صاحب قہر، مدیر انقلاب کی موصوف نے بلا کسی درخواست کے، کتاب دیکھتے ہی بعض کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی اور پھر میری درخواست پر مفصل نوٹ لکھ کر مرہمت فرمایا۔ پھر یہی نہیں، بلکہ دارالعروبہ تشریف لا کر مزید بحث و تحقیق کا موقع عنایت کیا۔ ان کے مشوروں کا ایک معتد بہ حصہ تو مؤلف نے بلا پس پیش قبول کر لیا۔ اور کچھ اپنی حقیر معلومات کی روشنی میں نہ قبول کر سکا۔ اور بعض ایسے مشورے بھی تھے جن کے متعلق کوئی قطعی رائے نہ قائم ہو سکی۔ ان کا ہم نے حاشیوں میں ذکر کر دیا ہے۔ ایک صاحب علم کا کتاب میں جہاں جہاں ذکر ہے، اس سے مراد قہر صاحب ہی ہیں۔ ان کی عنایات رسمی شکرے کے حدود سے بالاتر ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کی ہمہ گیر دعوت سے متعلق ان کی جامع تصنیف جلد از جلد مکمل ہو کر منظر عام پر آجائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

عاجز

مستعد عالم ندوی

دارالعروبہ - راولپنڈی

۳۱ رجب ۱۳۱۵ھ

عرضِ موف

آج سے نو دس برس پیشتر (۱۹۳۵ء) جب راقم نے عربی زبان میں اسلامی ہند کی تاریخ لکھنا شروع کی، تو ہندوستان کی مشہور اور بدنام وہابی تحریک سے ابتدائی واقفیت پیدا ہوئی۔ جو دو چار کتابیں دستیاب ہو سکیں، دیکھیں اور "الحركة الوهابية الهندية السياسية" کے عنوان سے زیر تحریر تاریخ میں ایک باب کا اضافہ ہو گیا۔ جس کا ایک ٹکڑا مرحوم الضیاء کے آخری نمبر (شعبان ۱۳۵۴ھ - دسمبر ۱۹۳۵ء) میں شائع بھی ہوا تھا۔ پھر وہی مقالہ اردو کے لباس میں (وہابیت: ایک اہم دینی و سیاسی تحریک) کی سرخی کے ساتھ الہلال (پٹنہ) کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا (اپریل - مئی - جون ۱۳۵۴ھ) اور خود اس تحریک کے مرکز عظیم آباد اور خاص کر صادق پوری حلقوں میں بھی تحسین و قبولیت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس سے سمند شوق کو ایک اور تازہ یانہ لگا اور مزید چھان بین جاری رہی۔

حسن اتفاق کہ ان ہی دنوں میں محبِ مخلص مولانا ابوالحسن علی ندوی، حضرت سید شہید کی سیرت مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس لئے بحث و مذاکرہ کے

بعد دو دوستوں کے درمیان یہ طے پایا کہ علی میاں سید صاحبؒ کی سیرت مرتب کریں اور یہ گنہگار مشہد بالاکوٹ (۱۲۴۶ھ) سے اپنا قلمی سفر شروع کرے۔ ان دونوں میں جو علم و عمل کا جامع، مستعد اور سراپا سوز و درد تھا، اس نے اپنا کام جلد ختم کر لیا جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ ان سطروں کے لکھنے سے بہت پہلے سیرت سید احمد شہیدؒ کے دواڈلشن نکل کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ قلمبر اڈلشن بھی بہت جلد منصہ شہود پر جلوہ گر ہو جائے۔

اس بے عمل کا دائرہ عمل نسبتاً الجھا ہوا اور پرخطر بھی تھا۔ حکومت وقت کے خوف سے معاصر اور آزاد باخبر حلقوں نے کوئی یادداشت محفوظ نہیں رکھی۔ اور تو اور صادق پور میں بھی کوئی معقول تحریری سالہ موجود نہیں تھنے اور دیکھنے والے آنکھیں بند کر چکے۔ اور ایک آدھ واقف کار نظر بھی آئے، تو پہلی سختیوں کا رعب دل پر اب تک بیٹھا ہوا۔ عظیم آباد پٹنہ میں سات سال مسلسل قیام (۱۲۴۷ھ) اور ایک مشہور اور قیمتی کتاب خانے (خدا بخش اور نیٹیل پبلک لائبریری پٹنہ) کی تمام آسانیوں کے باوجود مواد کے فراہم اور تلاش کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرتا پڑا۔ اور سات آٹھ سال کی مسلسل جدوجہد کے باوجود بعضے گم شدہ کڑیوں کا سراغ اب تک نہیں مل سکا۔ مجبوری میں جو کچھ ہوسکا، حاضر خدمت ہے۔ مزید چھان بین کا سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔ اللہ نے چاہا تو دوسرے اڈلشن میں یہ کوتاہیاں دور ہو جائیں گی۔

(۲)

حضرت سید شہیدؒ کی تحریک تجدید و جہادِ ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک عام طور پر وہابی تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اور اپنوں اور غیروں، تمام حلقوں میں یہ کوشش کی جاتی رہی ہے کہ نجد کی دعوتِ توحید و اصلاح سے اس کا ڈانڈا بلا دیا جائے۔ ہر چند کہ دونوں تحریکوں کا سرچشمہ (کتاب و سنت) ایک ہے اور رجحانات بھی ملتے جلتے ہیں، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ دونوں کی نشوونما الگ الگ ہوئی اور ایک پر دوسرے کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس تحریک کے مطالعے کے دوران میں نجد کی دعوتِ توحید کے متعلق ایسی غلط بیابانیاں بلکہ زہر افشانیاں اور دشنام طرازیاں نظر سے گزریں کہ یارائے ضبط نہ رہا، اور نجد کی دعوتِ تجدید و اصلاح نے کچھ عرصہ کے لئے توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اور اللہ کا کرنا ایسا ہے کہ زیرِ نظر کتاب سے پہلے دعوتِ تجدید کی تاریخ، محمد بن عبد الوہاب :- ایک مظلوم اور بدنام مصلحؒ کے نام سے مکمل ہو گئی۔

گو اس رسالے کا اصل موضوع ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک اور اس میں بھی خاص کر شہدِ بالا کوٹ کے بعد کے واقعات و حالات کا جائزہ لینا ہے۔ تاہم ربطِ کلام اور وہابی تحریک نام کی شہرت کے باعث، حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور وہابیت پر دو باب شروع میں بڑھا دیئے گئے ہیں۔ ہر چند کہ لفظ وہابیت کا اطلاق دنیا کی کسی تحریک پر صحیح نہیں۔ نجد کی

دعوت کے علم بردار شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی طرف اگر نسبت کرنا ہو تو محمدی کہنا چاہیے۔ علاوہ بریں ان کے ماننے والے عام طور پر اپنے کو خنبلی کہتے ہیں۔ علمائے خنابلہ کی کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ محمد بن عبدالوہابؒ نے ان سے زیادہ ایک حرف نہیں کہا۔ البتہ عزم و عمل کی مروہ قوتوں کو بیدار ضرور کیا۔ بے جان پیکروں میں زندگی کی حرارت ڈال دی اور ایک پورے خطے کو اسلامی رنگ میں شرا بھر کر دیا۔ اور آپ جانتے ہیں، یہ ایسا گناہ ہے، جسے شاطرانِ فرنگ اور ان کے ہوا خواہ معاف نہیں کر سکتے۔ نجد کے بعد وہابیت کا لیبیل سید شہیدؒ کے ماننے والے ہندوستانی مجاہدوں پر بھی لگایا گیا، جو بار بار کی تردید کے باوجود آج بھی قائم ہے۔ اور یہ گالی اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ بعض اچھے خاصے مخلص مسلمان بھی مجاہدین کو وہابی ہی کے نام سے جانتے ہیں اور اس سوختہ سامان نے تو اب تنگ آکر اس لقب (وہابی) سے گھبرانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں وہابیت پر چند صفحے اسی مناسبت سے لکھے گئے ہیں، جو شاید اصحاب نظر کی نگاہ میں ناقابل قبول نہ ہوں۔

(۳)

پچھلے چند برسوں میں جن صاحبوں نے سید شہیدؒ اور ان کے ماننے والوں پر کچھ لکھا ہے، ان میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور (ف ۱۳۶۳ھ) اور مولانا ابوالحسن علی ندوی قابل ذکر ہیں۔ مولوی

طفیل احمد صاحب مصنف (مسلمانوں کا روشن مستقبل) نے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر ان کا زیادہ تر اعتماد، مجاہدین ہند کے خاص کرم فرما ڈاکٹر ولیم ولسن ہنٹر پر رہا ہے۔ مولانا سندھی کی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک وسیع مطالعہ اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے۔ مگر (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے) انھوں نے حزب ولی اللہ کی تشکیل اور من مانی توجیہ کی خاطر سید صاحب کے ماننے والوں اور خاص کراہل صادق پور پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اور ان کی کمزوریوں کی تنقید و مذمت میں ان کا قلم اعتدال پر قائم نہیں رہ سکا ہے۔ راقم نے ان کی زندگی ہی میں اس کتاب پر تنقید کی تھی اور اہل صادق پور کے صحیح حالات پیش کئے تھے (ملاحظہ ہو: مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب (سیرت سید احمد شہید) سید صاحب کی سوانح، ان کی تعلیمات، اور مشن پر بے مثل کتاب ہے اور اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، سب پر بھاری ہے، مگر افسوس کہ میرے عزیز ترین دوست اور مخلص بھائی کا طریق نظر و فکر خالص عقیدت مندانہ ہے۔ اور انھوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے۔ راقم کی روش ان دونوں اصحاب علم و فضل کے مقابلے میں بین بین کی سی

۱۵ افسوس کہ ان سطروں کے چھپنے کے بعد مولوی سید طفیل احمد صاحب نے بھی دار آخرت کی راہ اختیار کر لی۔ (۱۳۶۵ھ) اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

رہی ہے۔ یہ گنہگار سید صاحبؒ کی تحریک تجدید و جہاد کو ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک سمجھتا ہے۔ اور مولانا سندھیؒ کی طرح ان کی دعوت کو کسی اندرونی یا بیرونی تحریک کا ضمیمہ نہیں خیال کرتا اور نہ انھیں کسی امیر جماعت کا تقشٹ یا کمانڈر انچیف تصور کرتا ہے۔ دوسری طرف جیسا کہ زیر نظر صفحات کے مطالعے سے واضح ہوگا، سید صاحبؒ یا ان کے اصحاب خاص کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ نیز مستقبل میں ماضی کی غلطیوں سے بچنے کے لئے پچھلی فروگزاشتوں کی نشان دہی ضروری خیال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق فکر بہت کم لوگوں کو خوش کر سکے گا۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس کی مخالفت میں آوازیں بھی بلند ہوں۔ ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس گنہگار نے جا بجا جائز اور بے لاگ تنقید کرنے کی جرأت کی ہے۔ اگر کوئی پاؤں لٹریچر اور صالح فضا تیار کرتا ہے، تو پھر سپرد عام کی خاطر حق کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

آخر میں ایک حرف مآخذ سے متعلق بھی عرض کر دوں۔ راقم کی یہ کوشش یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ معاصر شہادتوں اور اصلی مآخذ سے کام لیا جائے۔ کتاب شروع کرنے سے پہلے آخری باب کتابیات (Bibliography) نظر ڈال لی جائے۔ تو بین السطور تنقیہوں کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اس کتاب یا کتابچے کی تیاری میں جن قیمتی کتابوں، رپورٹوں، سرکاری دستاویزوں اور قلمی ذخیروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ ان تک اس بے برگ و بے نوا طالب علم کی رسائی مشکل تھی، اگر بزرگوں، دوستوں

اور عزیزوں کی عنایت اور معاونت نہ ہوتی۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ جن بزرگ
 نے قیمتی کاغذات کی فراہمی میں سب سے زیادہ مدد دی ہے۔ انھوں نے ہر ارکے
 باوجود نام ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہر حال یہ حقیر ان تمام اہل علم کا
 شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ یہ عنایتیں جاری رہیں گی
 نیز اہل علم و ارباب نظر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ حقیر کی کوتاہیوں
 اور لغزشوں پر متنبہ کرنے میں مطلق تامل نہ فرمائیں۔
 یہ کج معرکہ رقم اپنی طالب علمانہ حیثیت اور کم علمی سے خوب واقف
 ہے۔ ہر مفید مشورہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اور تو اور معاونانہ
 تنقیدوں سے بھی کام کی بات مل سکی، تو اظہار امتنان کے ساتھ احتیاج
 کی جائے گی۔

پہلا باب

وہابیت کیا ہے؟ وہابیت کی نسبت عام طور پر شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب بن سلیمان نجدی کی طرف کی جاتی

ہے۔ شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ میں ہوئی۔ اُن کی نشوونما اور تربیت صحرائے عرب ہی میں ہوئی۔ تحصیل علم کے لئے مدینہ منورہ اور بصرہ تک کے سفر کئے۔ ان کی ولادت کے وقت یعنی بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ دین کے ہر شعبہ میں نجد و عرب کے کلمہ گویا انحطاط پذیر تھے۔ اور ایک نجد و عرب ہی پر کیا موقوف ہے، ساری اسلامی دنیا شرک و بدعات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ کوئی سیاسی شعور باقی نہیں رہا تھا، جہاں کچھ طاقت تھی، وہاں ملکیت کا دور دورہ تھا۔ یہ حالات دیکھ کر محمد بن عبد الوہاب کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی۔ بالکل نوجوانی ہی میں اصلاح و تجدید کی دعوت دینا شروع کی۔ اپنے گرد و نواح کے مسلمانوں کو کتاب و سنت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اور اس سلسلے میں ہر طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ تکلیفیں سہیں۔ پہلے بوڑھے باپ ہی کی خفگی برداشت کرنا پڑی۔ پھر اپنے آبائی وطن عینہ سے نکلنے پر مجبور کئے گئے۔ آخر چند برسوں کے

ابتداء کے بعد ذریعہ (نجد) کے امیر محمد بن سعودؒ (ف ۱۱۷۹ھ) کے ہاں پناہ ملی۔ امیر اور اس کے عزیز دعوتِ توحید کے سرگرم حامی بن گئے اور ان کی مدد اور معاونت کے بل پر شیخ الاسلام نے تبلیغ اور زوروں پر شروع کر دی تا آنکہ کامیابی ان کے قدم لینے لگی۔ شمعِ توحید کے پروانے اطراف و اکناف سے آ کر شیخ الاسلام کے حلقہٴ درس میں حاضر ہوتے اور پھر لوٹ کر اپنے علاقوں میں اللہ کا پیغام پہنچاتے۔

محمد بن سعود کی وفات ۱۱۷۹ھ میں ہوئی۔ اور اس کا بیٹا عبدالعزیز بن محمد بن سعود تاج و تخت کا مالک ہوا۔ عزم و ہمت میں یہ اپنے باپ سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بڑھا چڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے زمانہ حکومت میں دعوت کی توسیع اور تبلیغ میں بڑی ترقی ہوئی۔ خود شیخ الاسلام بنفس نفیس عام تبلیغی کاموں کی دیکھ بھال کرتے۔ امیر عبدالعزیز صرف ایک مطیع شاگرد کی طرح ان کے احکام اور ہدایتوں کی تعمیل کرتا۔ شیخ نے ۱۲۰۶ھ میں بالترتیب سال کی عمر پا کر وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پوتے تبلیغ و دعوت کا فریضہ سرگرمی کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ دوسری طرف امیر عبدالعزیز برابر اپنا دائرہ حکومت وسیع کرتا رہا، تا آنکہ نجد کا پورا علاقہ اس کے زیرِ نگین ہو گیا۔ حجاز پر بھی چڑھائی کی۔ اور مکہ معظمہ پر اس کا عارضی قبضہ بھی ہو گیا۔ پھر ترکوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔ امیر عبدالعزیز ذریعہ کی جامع مسجد میں نماز پڑھاتے ہوئے ایک ایرانی شیعہ کے ہاتھوں شہید ہوا (۱۲۱۶ھ) اور اسی سال

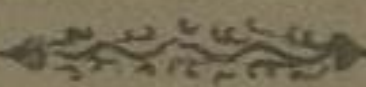
ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اس کا بیٹا سعود بن عبدالعزیز بن محمد مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوا۔ اور حرم کو
شہرک و بدعت کی آلودگیوں سے پاک کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اہل
نجد کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان کی نگاہیں شام کی طرف اٹھنے لگیں اور تمام دنیا کے
اسلام کو دعوتِ توحید سے آشنا کرنے کا خیال ان کے دلوں میں گدگدی پیدا کرنے لگا
ان کی دینی غیرت اور قومی شجاعت کامیابی کی ضمانت تھی۔ شام اور عراق کے
علاقوں پر کئی کامیاب حملے بھی کئے، لیکن خلافت کے علم بردار قسطنطنیہ کے عرش
نشین ترک۔ عربوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھنا۔ کب گوارا کر سکتے
تھے، انھوں نے مقابلہ سے خود تنگ آ کر محمد علی پاشا، خدیو مصر سے امداد
طلب کی۔ ترک (ترکی مرکزی حکومت۔ آستانہ) محمد علی پاشا کے بڑھتے ہوئے
اقتدار سے الگ فائز تھے۔ انھوں نے "سانپ مرے اور لاکھی نہ لوٹے" پر
عمل کرتے ہوئے، محمد علی کو نجدیوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ چند سالوں کی مسلسل
اور خوں ریز جنگوں کے بعد نجدیوں کو شکست ہوئی۔

سعود بن عبدالعزیز کی وفات ۱۲۲۹ھ میں ہوئی۔ اس کا بیٹا عبداللہ
بن سعود بن عبدالعزیز گواپنے باپ سے بہادری میں بڑھ چڑھ کر تھا، مگر تدبیر
میں اسے اپنے اولوالعزم باپ سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ سعود کی وصیت تھی
"مصر لوں سے کھلے میاں میں ہرگز مقابلہ نہ کیا جائے۔" مگر عبداللہ اپنی مردانگی اور
شجاعت کے زعم میں نصیحت نظر انداز کر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجد کے بادیہ نشین
جدید یورپی اسلحہ اور آلات جنگ کی تاب نہ لاسکے، آخر ۱۲۳۳ھ میں عبداللہ

بن سعود نے سپر ڈال دی۔

محمد علی مصری نے اسے آستانہ بھجج دیا، جہاں وہ بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ اور محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا فاتح درعیہ نے نجدی پاپیہ تخت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بوڑھوں، بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ مہینوں تک مصری فوج لوٹ مار کرتی رہی۔ مغربی فوجیں فتح پانے کے بعد جو کچھ کرتی ہوں گی، مصری فوج نے اس سے کچھ زیادہ ہی کیا۔ یہ تھی تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں مصری اور ترکی مسلمانوں کی حالت اور ان کا نظریہ حکومت۔ اہل نجد کی تاریخی سرگذشت طویل اور دلچسپ بھی ہے۔ خاص کر ان کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن یہاں ہمارا مقصد نجد کی تاریخ بیان کرنا نہیں اس موقع پر راقم نے صرف ان کی ابتدائی تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے، تاکہ آئندہ اس مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو، اور ہندستان کے بدنام ”وہابی“ مجاہدین کے حالات پڑھتے وقت، نجد کے مظلوم اور موحید حبیبی ”وہابیوں“ کی تاریخ بھی پیش نظر رہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتاب (محمد بن عبد الوہابؒ)۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح جس کا ذکر دیباچہ میں آچکا ہے۔



دوسرا باب

بدنام وہابی نجدیوں کا یہ آٹھان ترکوں اور انگریزوں کی نگاہوں میں
 بری طرح کھٹکنے لگا۔ ترکوں کو اس لئے کہ ان کے حرمین
 شریفین کی "خادمیت" پر حرف آتا تھا، اور انگریزوں کو اس لئے کہ نجدی
 بحری طاقت نے خلیج فارس میں ان کے چھلکے چھڑا دیئے تھے۔ یہ ایک
 دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ درعیہ کی فتح (۱۲۳۳ھ) پر پیراہیم بن
 محمد علی مصری کو مبارکباد دینے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا خاص
 قاصد بھیجا تھا۔ دوسری طرف محمد علی کی فوج میں متعدد فرانسیسی اور
 اطالوی افسر اور ڈاکٹر تھے۔ وسط عرب میں ترقی اور تجدد کی لہر ان
 سب کے گلوں کی پھانسی بن گئی۔ اور وہ ان کے خلاف اپنے مقبوضات
 میں پروپینڈا کرنے لگے۔ ترکوں نے مولویوں اور پیروں کی مدد حاصل کی
 محمد عبدالوہاب کی طرف نسبت کریں، تو قاعدہ سے "محمدی" کہیں گے،
 جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے، مگر "محمدی" کا لقب تو بدنام کرنے کے لئے
 کافی نہیں تھا۔ اس لئے شیخ الاسلام کے والد عبدالوہاب کی طرف نسبت

کر کے ”وہابیت“ کا لقب ایک مذہبی گالی کے طور پر ایجا د کیا گیا۔
 ترکوں اور انگریزوں کا یہ پروپگنڈا خالص سیاسی حیثیت رکھتا تھا،
 گمراہیوں نے اسے مذہبی رنگ دینا شروع کیا۔ تاکہ مشائخ اور خوش عقیدہ
 مسلمانوں کو آسانی کے ساتھ مشتعل کیا جاسکے۔ مولویوں اور پیروں کی خدمات
 سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مکہ معظمہ کے شیخ احمد زینی دحلان (ف ۱۳۱۳ھ)
 اور بدایوں کے مولوی فضل رسول (ف ۱۲۹۷ھ) اور ان کے پیروں کی
 کوششوں سے افراط پر داریوں اور بہتان طرازیوں کا ایک انبار لگ گیا،
 جس سے کم و بیش آج تک جاہل اور عوام متاثر ہیں۔ مگر اہل علم میں اب یہ کوئی
 ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے۔ ساحرانِ فرنگ کی عشوہ طرازیوں کا اتنا تجربہ
 ہو چکا ہے کہ اب یہ تاریخی حقیقتیں خود بخود نمایاں ہونے لگی ہیں اور پروپگنڈوں کا
 تاریک نقاب تار تار ہورہا ہے۔

ہندستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور
 نجد کی دعوت توحید و اصلاح کا فرق
 یہ اسی پروپگنڈے کا اثر تھا کہ ہندستان
 میں حضرت سید احمد شہید دہلوی
 (۱۲۰۱-۱۲۷۶ھ) اور مولانا

اسماعیل شہید دہلوی (۱۱۹۶-۱۲۷۶ھ) کے ماننے والوں اور نقش قدم پر چلنے والوں کو
 بھی ”وہابی“ کے لقب سے یاد کیا گیا۔ حالانکہ انھیں نجد کے موحدین سے کوئی
 تعلق نہیں تھا یہ اور بات ہے کہ اصل سرچشمہ (کتاب و سنت) کی وحدت
 کے باعث دونوں تحریکوں کے درمیان بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

توحید پر دونوں تحریکوں میں خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ شیخ الاسلام کی کتاب التوحید اور مولانا شہیدؒ کی تقویت الایمان بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پھر بھی غور سے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے، تو بعض اہم اور بنیادی مشلوں میں بھی اختلاف رائے کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ طریق کار کا فرق تو قدم قدم پر ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن پروپگنڈے اور سیاسی وسیسہ کاریوں کا براہمو، اسلامی ہند کی اس پہلی تحریک تجدید و جہاد کو بھی ”وہابیت“ کا نام دے کر بُری طرح بدنام کیا گیا۔ اور انگریز مصنفوں اور ان کی دیکھا دیکھی اپنوں نے بھی اس نام کو اتنی شہرت دی کہ آج حضرت سید احمد شہیدؒ کے پیرواد و رمانے والے اسی بدنام لقب (وہابیت) سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور راقم کو خود اس تحریر کے آغاز میں ”وہابیت“ کی حقیقت بیان کرنا پڑی۔ لیکن کوئی غلط بات، صرف شہرت اور پروپگنڈے سے حقیقت نہیں بن سکتی۔ دجل اور فریب کا پردہ ایک نہ ایک دن چاک ہو کر رہتا ہے۔ آئیے ہم آپ کو داخلی اور خارجی شہادتوں کی روشنی میں دکھائیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی دعوت تجدید و جہاد نجد کی تحریک توحید و اصلاح سے بالکل متاثر نہیں ہوئی۔

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک) (۱۳۶-۱۳۹)

اور راقم کی ”مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر“ (۱۱۶-۱۰۲)

۲۔ اصل میں ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک پروہابیت کا اطلاق صرف اس لئے کیا گیا کہ وہابیت کی اصطلاح پہلے کالی کے طور پر کافی مشہور ہو چکی تھی۔ اب ایک نئی اصطلاح ایجاد کرنے اور چلانے کی زحمت کیوں اٹھانی جاتی۔

(۱) یہ ایک واقعہ ہے کہ حضرت سید احمد شہید (مولود ۱۲۱۲ھ) کو کم عمری ہی سے تجدید و احیاءِ سنت کی فکر دامن گیر تھی۔ اور ان کی دعوت میں ترکِ بدعات کی نسبت جہاد فی سبیل اللہ پر زیادہ زور تھا۔

اس کے برعکس شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت میں توحید اور ترکِ بدعات کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شیخ الاسلام کی کتاب التوحید میں جہاد پر کوئی خاص باب یا فصل نہیں ہے۔ دوسری طرف سید شہیدؒ کا کوئی مکتوب جہاد کے ذکر سے خالی نہیں ملتا۔ غالباً یہ دونوں ملکوں کے طبعی اور مقامی حالات کا نتیجہ تھا۔ نجد اور اس کے ارد گرد مسلمانوں ہی جیسا نام رکھنے والے، بدعات اور شرک کی آلودگیوں میں مبتلا تھے۔ ہندوستان میں اپنوں کی خرابی کے ساتھ ساتھ سمندر پار سے آئی ہوئی ایک قوم زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے رہی تھی۔ مزید برآں ایک ہمسایہ لیکن نیم وحشی مذہبی گروہ پنجاب و سرحد کے غریب مسلمانوں کے لئے مستقل فتنہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے سید شہیدؒ کے خلفاء اور مریدوں کا سارا جوش عمل جہاد و قتال ہی کی طرف مائل تھا۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے اس راہ میں ہمیشہ سرکھٹ رہے۔ اور آج بھی ان کا ایک گروہ جن نیت کے ساتھ (خواہ غلط ہی رہی) آیتہ ربانی۔

وَمِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ
صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ
ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، کہ
انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اس میں سچے اترے۔ پھر بعض تو ان میں وہ ہیں

جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں۔ اور بعض ان میں

مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

عَلَيْهِمْ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ

وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا

بَدَّلُوا تَبْدِيلًا (الاحزاب-۳۳)

کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

سید شہیدؒ کا ظہور اس وقت ہوا، جب نجدیوں کی دعوت نجد اور اس کے

اطراف میں محدود تھی۔ اور حجاز پر قبضے سے پیشتر (۱۲۱۸ھ) دنیا سے

اسلام میں انھیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ محمد علی مصری نے ۱۲۲۴ھ میں انھیں

حرمین سے بے دخل کیا۔ اس طرح بحرین پر ان کا قبضہ نو سال سے زیادہ نہیں

رہا۔ اور یہ زمانہ بھی یکسر جنگ و جدال میں بسر ہوا۔ حضرت سید شہیدؒ

اور ان کے رفقاء ۱۲۳۴ھ میں حج بیت اللہ سے فارغ ہوئے جبکہ مکہ مکرمہ میں نجدیوں کا نام و

نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ مکہ مکرمہ کے حکام حاجیوں کو اہل نجد سے اونے تعلق کے شبہ پر بھی تنگ کیا کرتے

تھے۔ پھر نجدی وہابیوں سے سید صاحبؒ کے ملنے اور متاثر ہونے کا واقف زمانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

نیز یہ بھی پیش نظر رہے کہ سید صاحبؒ حج سے پیشتر ہی سکھوں سے جہاد کا عزم کر چکے تھے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سید شہیدؒ کی دینی تحریک، تجدید و احیائے دین کی

ایک مستقل تحریک تھی۔ مشیت الہی یہ ہوئی کہ تجدید امت کا سہرا ان کے

سر رکھا جائے۔ تو فائق باری سے انھیں رفیق اور جاں نثار بھی ایسے میسر

آئے، کہ صحابہ کرامؓ کے بعد اتنے نفوس قدسیہ کا ایک جاہلونا، تاریخ کے صفحات

میں نظر نہیں آتا۔ نجد کی دعوت تجدید سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انگریز

مصنفوں میں ولیم ولسن ہنٹر W. W. Hunter نے حضرت سید

شہیدؒ اور ان کی جماعت پر ناروا اور رکیک حملے کئے ہیں۔ اور ان کے پیروؤں کی "باغیانہ" سرگرمیوں پر اس نے بہت تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ اسی کے دماغ کی ایج ہے کہ سید شہیدؒ نجد کے وہابیوں سے متاثر تھے، اور اسی کی تقلید میں اپنوں اور غیروں نے بھی اس غلط بیانی کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ اس مختصر سی تحریر میں ہنٹر کی غلط بیانیوں پر تفصیل سے گفتگو نہیں کی

کیجا سکتی۔ یہاں ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ مجاہدین کا یہ سفید فام دشمن اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود اس سلسلے میں جو کچھ لکھ سکا ہے اس سے بھی سید صاحبؒ کا نجدیوں سے ملنا ثابت نہیں ہوتا۔ ہنٹر صاحب فرماتے ہیں "قیام مکہ کے زمانے میں حکام کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ اس لئے کہ ان کی دعوت ان بدوؤں (محمد بن عبدالوہاب کے ماننے والوں) سے ملتی جلتی تھی۔ جنہوں نے گزشتہ سالوں میں مقامات مقدسہ کو بہت گزند پہنچایا تھا۔" مجاوروں نے ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کیا اور حرم سے نکال دیا۔" گو یہ حقارت کا برتاؤ "اور حرم سے نکالنے کا واقعہ" یکسر ہنٹر کے دماغ کی

ساختہ ہیں اہل نجد اور ان کی دعوت توحید و اصلاح امت سے کوئی اختلاف یا بغیر نہیں۔ ہمارا عمل کتابت سنت پر ہے، ہم نہ سید شہیدؒ کے مقلد ہیں نہ محمد بن عبدالوہابؒ نجدی کہتے یہاں صرف غیروں اور اپنوں کی اس پھیلائی ہوئی غلط بیانی کا ازالہ مقصود ہے کہ سید صاحبؒ کی دعوت تجدید و جہاد، نجد کی تحریک توحید متاثر تھی "یہ بحث خالص علمی اور تحقیقی ہے۔ حرب حقائد یا سیاسی پروپیگنڈا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

پیداوار ہے، پھر بھی ہم یہاں اسے نظر انداز کرتے ہوئے اہل نظر و ارباب انصاف سے
پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ سید شہید (ش ۱۲۳۱ھ - ۱۲۸۱ھ)
شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب (ف ۱۲۹۲ھ - ۱۲۶۱ھ) کی تعلیمات سے متاثر ہوئے
تھے؟ ورنہ ہمارے پاس اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ مکہ مکرمہ کے حکام و
امراء نے سید شہید کی پوری خاطر مدارات کی اور انھیں ہر آنکھوں پر بٹھایا۔
خود منظر اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتا ہے:-

”کسی وہابی کے لئے ممکن نہ تھا کہ جان جو کھوں میں ڈالے بغیر مکہ مکرمہ کی
سڑکوں پر چل سکے۔ یہ حال ۱۲۸۳ھ سے ۱۲۸۶ھ تک رہا۔“

اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقا
۱۲۳۱ھ - ۱۲۸۱ھ میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ
بدنام وہابی مبلغوں سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ان کی تعلیم سے متاثر
ہوئے؟ اصل یہ ہے کہ دنیاۓ اسلام کے عام انحطاط اور پستی کے عالم میں
نجدی بدوؤں کا اٹھان اور ان کی شمشیر زنی ”یورپی سیاست کاروں اور
اسلامی خدمت“ کے ترکی اجارہ داروں کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور انھوں نے
”نجدیوں“ کو وہابی کا نام دے کر بدنام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دنیاۓ
اسلام کی ہر مفید تحریک پر وہابییت کا لیبل لگا نامعاذین اسلام کا عام شعار ہو گیا۔
انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مضمون ”وہابییت“ کا لکھنے والا مشہور شیعہ

اسلام اور شاتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم مار گزلیو تھے عجیب و غریب حماقتوں کا مرتکب ہوا ہے۔ مولانا شہیدؒ کو سید صاحبؒ کا بھانجا یا بھتیجا

اور صراطِ مستقیم کو وہابیہ ہند کا قرآنِ کتا ہے Wahabiyah

اس کا مقالہ ”وہابیت“ (مندرجہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) تاریخی و تصنیفی اغلاط کا مضحکہ انگیز مرقع ہے۔ لیکن اسی انسائیکلو پیڈیا میں ابن سعود اور (سید) احمد کے مقالے اچھے اور عالمانہ ہیں۔ ہمیں یہاں احمد والے مقالے سے بحث ہے۔ اس کا لکھنے والا ایک حد تک سید شہیدؒ اور محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریکیں کو سمجھا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فرق اس کی نگاہ میں ہے لکھتا ہے:-

”کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ (سید صاحب) و غلط و ارشاد کے لئے دورہ کرنے لگے۔ ان کے خیالات ایک حد تک عرب وہابیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ (سادہ عبادت، بدعات سے اجتناب، خرافات پر عقیدت سے بعد اور انبیاء کی تنظیم میں حد سے زیادہ غلو سے پرہیز۔) ان امور میں ان کے اور نجدی وہابیوں کے درمیان مماثلت ہے۔

۱۲۲۶ھ میں سید احمد شہیدؒ حج کے لئے مکہ روانہ ہوئے اور حب

دو سال کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو پنجاب کے مسلمانوں کو جو ر و ظلم سے نجات دلانے کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔“

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اس میں شک نہیں کہ دونوں تحریکوں کے درمیان ایک حد تک مشارکت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ اور اصل سرچشمہ میں اتحاد کے باعث ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ کتاب و سنت سے براہ راست کتاب فیض کرنے والی جماعتیں جہاں بھی کام کریں گی، اُن کا طریق کار اور دعوت کی بنیادی فکر ملتی جلتی ہوگی۔ لیکن اس "مماثلت و مشارکت" کی بنیاد پر جھوٹی تاریخ نہیں بنائی جاسکتی۔ اور یہ واقعہ اپنی جگہ ثابت اور متحقق ہے کہ سید صاحبؒ نجد کی تحریک توحید سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ اور نہ کسی نجدی عالم اور داعی سے ان کا ملنا ثابت ہے۔

وہابی اور اہل حدیث | اسی سلسلے میں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ مناسب ہوگا۔ ہندستان میں حضرت سید صاحبؒ کی

دعوت تجدید و جہاد کے ساتھ ساتھ اتباع سنت اور عمل بالحدیث کا چرچا بھی شروع ہوا۔ خود سید صاحبؒ اور اُن کے خاص ماننے والے یعنی اہل صادق پور تو اپنے "کو حنفی مع القول بالترجیح" کہتے تھے۔ مگر خود سید احمد صاحبؒ کی جماعت میں مولانا اسماعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۴ھ) کے اثر سے خالص عمالین بالحدیث، کا بھی ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ شروع شروع یہ دونوں طبقے یعنی حنفی اور اہل حدیث ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ دونوں کا زور جہاد پر تھا اور ان فروعی مسئلوں میں وہ روادار تھے۔ مگر آگے چل کر جب مجاہدین کی دار و گیر شروع ہوئی اور سہرا میں بالجہر کہنے والے پر وہابی "کاشبہ

کیا گیا۔ اور وہابی کے معنی سرکاری زبان میں باغی کے ہو گئے (جیسا کہ آئندہ

صفحات میں آتا ہے) تو ہندوستان کی جماعت اہل حدیث موجودہ شکل

میں نمایاں ہوئی اور ان کے سرگروہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی

(۱۲۵۶ھ - ۱۳۳۸ھ) نے سرکار انگریزی کی اطاعت کو واجب قرار دیا۔ اور

حدیث کے بعض مشہور حنفی علماء کو سرکار سے بغاوت کے طعنے دئے۔ ان

بیچارے کو یہ ہوش نہیں رہا کہ وہ اپنے کو سرکار کی زد سے بچانے کی فکر میں کیا

کر رہے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو کس پستی کی طرف لے جا رہے ہیں؟

مولوی محمد حسین صاحب اور ان ہی جیسے بعض علماء اہل حدیث کی روش کا

یہ نتیجہ ہوا کہ موجودہ جماعت اہل حدیث کا عام رجحان فروعی مسئلوں تک،

محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ پوری جماعت اہل حدیث

ایسی ہی ہے۔ حاشا وکلاء! ان ہی میں اہل صادق پور بھی ہیں، جو سید

صاحب کے عشق و محبت میں خود ان کے اہل خاندان سے بھی بڑھ چڑھ کر

۱۲۵۶ھ مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے جہاد کی مسوخی پہ ایک سالہ (الاقتصاد فی مسائل الجہاد) فارسی

زبان میں تصنیف فرمایا تھا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع کرائے تھے۔ معتبر اور ثقہ راویوں کا

بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انھیں "جاگیر بھی ملی تھی"۔ اس رسالہ کا پہلا حصہ ہمارے

پیش نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب غریب نمونہ ہے۔ نمونہ کیلئے مندرجہ ذیل اقتباس کافی ہو گا۔

ازیں مسئلہ ثابت و متحقق شد کہ کمال اسلام و ایمان و نجات اہل اسلام پر جہاد موقوف

نتیجہ مسئلہ اولیٰ نہج صریحیت۔ اگر مسلمانان را از فرائض دینی باز دارند مجروح عبادت برائے نجات کمال ایمان کافی است

پس آنا کہ الحج (ص ۵) ۱۳۱۴ھ و غیر ہم۔ ۵۳ رسالہ اشاعت السنۃ۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ہیں، نیز ہندستان کے طول و عرض میں سیکڑوں اہل حدیث ایسے ملیں گے جن کے دل اب بھی جذبہ ہوائے جمہور نہیں۔ اور وہ اپنے اسلاف کی روش پر سختی کے ساتھ قائم ہیں۔ اس کے علاوہ سید صاحبؒ کے ماننے والے اور ان کے مسلک کے مطابق جہاد و اصلاح کا ولولہ رکھنے والے اہل حدیث طبقہ کے اندر محدود نہیں۔ اہل دیوبند (جو یکے حنفی ہیں) کا ایک اچھا خاصہ طبقہ سید شہیدؒ کے مشربِ مسک پر چلنا اپنے لئے سرمایہٴ سعادت سمجھتا ہے۔ اہل دیوبند اور جماعت اہل حدیث کے علاوہ بھی، سمجھدار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کے مشرب و مسلک کو عین اسلام تصور کرتی ہے۔ یہ تمام طبقے عرف عام کے مطابق ”وہابی“ کی فہرست میں آتے ہیں۔ مگر انہیں اہل حدیث نہیں کہا جاسکتا۔ اہل حدیث، ایک بالکل دوسری جماعت ہے، جو باطنیوں اور شیعوں کے توڑ کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ کوئی نئی جماعت نہیں۔ بنو عباس کے اوائلِ عہد (دوسری صدی ہجری) ہی میں محدثین اور اہل حدیث کا گروہ ممتاز و مشہور تھا۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ جماعت اہل حدیث آئین و رفع یدین اور اس قسم کے دو چار فروعی مسئلوں پر قانع ہو کر رہ گئی ہے، بلکہ اب اس کی حیثیت ”جماعت“ سے زیادہ ”فرقہ“ کی ہو گئی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہندستان کے اصطلاحی ”وہابی“ اور اہل حدیث اور۔ اور راقم ان دونوں لفظوں کے استعمال میں اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ گو سچ پوچھئے تو لفظ ”وہابی“ کا اطلاق کسی گروہ پر صحیح نہیں۔

تیسرا باب

سید احمد شہید ^{۵۲} ۱۲۰۱ھ تا ۱۲۷۶ھ ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک کے داعی اول اور قائد حضرت

سید احمد شہید بریلوی کی ولادت ماہ صفر ۱۲۰۱ھ میں ہوئی۔

۱۲۸۶ھ
سید احمد شہید صغیر - راقم کو اگر کوئی طنز سے وہابی کہتا ہے، تو تردید کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر کوئی اہل حدیث کے نام سے یاد کرے، تو اس سے براءت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اہل حدیث سے تحریک اور گروہ بندی کی بڑھتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے موجودہ دور میں حنفیت اور شافعییت وغیرہ فقہی مذاہب ہونے کی جگہ مستقل "دین" بن کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف تحریک اور فرقہ بندی کا زور ہے، ضرورت اصول پر زور دینے اور فروع میں روادار ہونے کی ہے۔

۱۲۸۶ھ متفقون کے تسلسل کے لئے ہم نے سید صاحب کے مختصر حالات درج کر دیئے ہیں تفصیل کے لئے سوانح احمدی (محمد جعفر تھانوی) اور سیرت سید احمد شہید (ابوالحسن علی ندوی) کا مطالعہ کیا جائے بعض اصحاب علم نے اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک میں خود اس کے قائد کے حالات میں اختصار سے کیوں کام لیا گیا ہے عرض یہ ہے کہ ہم نے تحریک کے صرف اُس حصے کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے جس کے حالات نگاہوں سے اوجھل تھے، اور جن کے اظہار سے جاننے والے بھی اب تک ڈرتے تھے۔

۱۲۸۶ھ عام طبر پر مشہور یہ ہے کہ سید شہید کی ولادت پہلی محرم الحرام ۱۲۰۱ھ کو ہوئی۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانوی اور ان کی نقل میں دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی یہی تاریخ درج کی ہے، حالانکہ سید شہید کے تعلق سے زیادہ متذکر کتاب مخزن احمدی (جوان کے بوجہ مولوی سید محمد علی صاحب کی تصنیف ہے) میں ولادت ماہ صفر میں درج ہے۔ ولادت باسعادت حضرت سید المجاہدین - ۱۲۷۶ھ بعد گذشتن یک ہزار و دو صد سال آقہ گردید۔

(ورق مناسبت: - مخطوط)

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

تکیہ رائے بریلی (اودھ) میں حسنی سادات کا مشہور خاندان آباد ہے۔

سادات کا یہ تکیہ (جو دائرہ شاہ علم اللہ کے نام سے بھی مشہور ہے) رائے بریلی شہر سے میل ڈیڑھ میل دور ایک نہایت ہی پُر فضا ٹیلے پر واقع ہے۔ سید صاحب اسی حسنی خاندان کے گوہر شرب چراغ تھے۔ آپ نے رسمی تعلیم کم پائی۔ مشیت کو کچھ اور کام لینا تھا، معلموں نے لاکھ جتن کئے، پر آپ کی طبیعت مدرسوں کی فرسودہ تعلیم کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ اُمّی تھے۔ بعض عقیدت مندوں نے خواہ مخواہ انھیں اُمّی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب آپ کی عمر سترہ سال کی ہوئی۔ اور شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، تو روزگار کی تلاش میں گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ میں ایک مسلمان نواب کے ہاں کچھ دنوں قیام رہا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے، اور شاہ

عبد القادر صاحب دہلوی (ف ۱۲۳۵ھ)

کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب

دہلوی (ف ۱۲۳۹ھ) کے دست مبارک پر بیعت کی۔ یہ

۱۲۲۲ھ کا ذکر ہے۔ جب آپ کی عمر ۲۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔

دہلی کے اس پہلے سفر کے بعد آپ وطن لوٹ آئے اور تقریباً دو برس

وہیں رہے۔ اسی مدت میں آپ نے نکاح کیا۔

اس کے بعد پھر آپ نے راجپوتانہ کا سفر اختیار کیا، جہاں نواب

امیر خاں کا قیام تھا۔ راستہ میں دہلی ٹھہرتے ہوئے نواب امیر خاں کے پاس پہنچے
(تقریباً ۱۲۲۷ھ) سید صاحب کے دل میں جہاد کا شوق تو بدو شعور سے
موجود تھا ہی، نواب کی فوج میں اس شوق کے عملی جامہ پہنانے کا موقع
ملا۔ اور اس غرض سے ایک مدت تک (سوانح احمدی میں یہ مدت
سات برس بیان کی گئی ہے) وہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے۔ اس سے
یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نواب امیر خاں کی فوج میں آپ کا قیام صرف واعظ
و مبلغ ہی کی حیثیت سے تھا۔ بلکہ وہ متعدد لڑائیوں میں ایک دستے کے
امیر اور نواب کے مشیر خاص کی حیثیت سے شریک رہے۔

لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی، تو مجبوراً میں آپ نے
پھر دہلی کا رخ کیا (۱۲۳۱ھ) اصل میں سید صاحب کو توقع تھی کہ نواب
کی اعانت سے ہندوستان کے اندر حقیقی جہاد کا موقع پیدا ہو سکے گا۔ مگر جب
نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی، تو یہ توقع ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور
دہلی لوٹ کر آپ کو اس غرض کے لئے علیحدہ اور مستقل جدوجہد کرنا پڑی۔
دہلی قدم رکھتے ہی کامیابی نے قدم لئے۔ خاندان ولی اللہی جو
عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔

نور حضرت شاہ عبدالعزیز (ف ۱۲۳۹ھ) کے داماد مولانا عبدالحی
(ف ۱۲۴۳ھ) اور ان کے بھتیجے مولانا شاہ اسماعیل شہید (ش ۱۲۴۶ھ)
اور فاندان کے دوسرے سرکردہ حضرات، آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے

اور ارشاد و ہدایات کا سلسلہ پھیلنے لگا۔ مولانا عبدالحی اور مولانا شہید کی محبت میں آپ نے ملک کے اطراف و اکناف کے دورے کئے۔ جہاں گئے، ان کے دم قدم سے توحید کی تعلیم پھیلی اور شرک و بدعت کی اندھیاری کا نور ہوئی۔ سوانح پڑھئے، تو آپ کی تاثیر و جاذبیت کا کچھ عجیب حال نظر آتا ہے۔

اثر پذیری اور جاذبیت کے ایسے دل ذریعہ مرقعے عہد صحابہؓ کے بعد پھر دیکھنے میں نہیں آئے۔ بے باغقیدت اور شخصیت پرستی کے جذبے سے بالکل الگ ہو کر عرض کیا جاتا ہے کہ سید صاحبؒ اور ان کے رفیقوں کے قدم بر زمین پر پڑ گئے، وہ سونا اگلنے لگی، اور ان کی نگاہیں جن دلوں میں اتر گئیں، وہ حقائق و معارف کا گنجینہ بن گئے۔ ایک مثال ہو تو پیش کی جائے۔ بہر حال نہ جاننے والوں کے لئے عرض ہے۔ ہمارے رئیس زادے اور ناظم ہمارے نوادے ولایت علی عظیم آبادی صادق پوری نے لکھنؤ میں شرف نیاز حاصل کیا اور نقد دل وہیں پار بیٹھے اور پھر ایسے حلقہ بگوش ہوئے کہ اپنی ذات تو خیر ایک چیز ہے، اپنے پورے خاندان کو قدموں پر لا ڈال دیا۔ اس کے بعد سید صاحبؒ کی تشریف آوری سے پٹنہ مشرف ہوا، تو خاندان کے تمام افراد نے بیعت کی۔ اور دامن ارادت سے وابستہ ہو گئے۔ اس وابستگی کا نتیجہ دیکھنا ہو، تو گورنمنٹ آف انڈیا کے ریکارڈ آٹھا کر دیکھو، مقدمات سازش کی رودادیں پڑھو، سرحد اور داورائے سرحد کی پہاڑیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے پوچھو۔ سید صاحبؒ کا

شہادت (۱۲۴۶ھ) سے لے کر پورے سو برس تک مسلسل (۱۸۲۳ء-۱۹۲۳ء)

جس طرح اس خاندان نے جہاد کا علم سر بلند رکھا، وہ قربانی اور مرفروشی کی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پڑی۔ عرض یہ کرنا تھا کہ سید صاحبؒ اور

ان کے رفیقوں نے ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۳۲ھ کے درمیان میرٹھ منظرِ نگر -

سہارنپور اور شمالی ہند کے بعض دوسرے اضلاع کا دورہ کیا۔ لوگوں کو توحید

اور اصلاحِ بدعات کی تلقین کی۔ لاکھوں نے بیعت کی اور ہزاروں آپ کی

تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان ہی دنوں پنجاب میں سکھوں کے

ظلم و ستم کی رودادیں سننے میں آئیں، تو سمنند شوق کو ایک اور تازیانہ لگا۔

اور عزمِ جہاد کو بروئے کار لانے کا زمانہ قریب معلوم ہونے لگا۔ پہلے سفر حج کو

۱۲۵۰ھ راقم پہلے عرض کر چکا ہے کہ سید صاحبؒ کو بدو شعور ہی سے جہاد کا شوق تھا، اور یہ عزمِ جہاد مسلسل

قائم رہا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جس مقام کو انھوں نے اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا، وہاں

سکھوں سے پہلا مقابلہ پیش آیا۔ ورنہ سید صاحبؒ انگریزوں کو بہر حال سکھوں سے

زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ مکاتیب اور دوسرے مستند وثائق سے اس کی تصدیق ہوتی ہے

اس کے معنی یہ نہیں کہ سکھ شاہی کے ظلم و ستم کی داستان سنیں، سکھوں کے ظلم اپنی

جگہ پر ہیں، اور مجاہدین کو پہلے انھیں کا تدارک کرنا پڑا۔ مقصود صرف اس غلط فہمی کا ازالہ

کرنا ہے، جو بعض نیک نیت لوگوں نے حالات کی تبدیلی سے مجبور ہو کر پیدا کر دی تھی کہ

سید صاحبؒ انگریزوں سے جہاد کا مطلق ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

۱۲۵۰ھ آپ کا سفر حج بھی مستقل جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عام بدامنی اور

سفر کی مشکلات کے باعث بعض علما نے سقوط حج کا فتویٰ دیدیا تھا۔ آپ کے رفیقوں مولانا

عبدالحی اور مولانا تمغیل شہید نے اس فتوے کی علمی تردید ہی کی تھی۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ترجیح دی۔ اثنائے سفر میں ہزاروں نے ہدایت پائی۔ گفتگو اور صحبت میں بلا کی تاثیر تھی۔ سید صاحب کا سفر حج، بے شمار برکتوں کا باعث ہوا۔ تقریباً

تین برس مسلسل سفر میں رہے۔ پہلی شوال ۱۲۳۶ھ عین عید کے روز

(۲۷ جون ۱۸۲۱ء) نماز کے بعد رائے بریلی سے رخت سفر باندھ کر روانہ

ہوئے۔ چار سو مرد، عورتیں اور بچے اس قافلے میں تھے۔ ہر منزل پر قیام اور

تبلیغ کرتا ہوا مبلغین اور مجاہدین کا یہ قافلہ عید الاضحیٰ ۱۲۳۷ھ میں حج

بیت اللہ سے مشرف ہوا۔ پھر مدینہ منورہ کی زیارت کی۔ اور دو تین

مہینوں کے بعد مکہ مکرمہ واپس ہوا۔ اور وہاں سات آٹھ مہینے قیام کر کے

ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ میں بادل محزون و دیدہ پر نیم علماء و صلحاء کا یہ گروہ وطن

مالوف کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ (۳۰ اپریل ۱۸۲۴ء) کو

(یعنی تقریباً تین برس کی غیر حاضری کے بعد) یہ قافلہ پھر اپنی منزل پر واپس

آگیا۔ مجاہدین کے کرم فرما ولیم ولسن ہنٹر فرماتے ہیں کہ "سید صاحب کو مکہ معظمہ

مکالا گیا۔" اور ان کے ساتھ برابر تاؤ کیا گیا۔ ہم اس کے برعکس دیکھتے ہیں کہ وہ

حج کے بعد بھی سات آٹھ مہینے حرم میں اقامت فرماہیں، اور بلاد حرم کے

ممتاز علماء آپ کے فیض صحبت سے مشرف ہو رہے ہیں۔ غلط بیانی کی

بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

جہاد | حج کے بعد پھر وعظ و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر اب کے

اصلی زور جہاد و ہجرت پر تھا۔ مولانا شہید اور مولانا عبدالحی اور دوسرے

ممتاز حضرات مختلف اطراف میں تبلیغ و ارشاد کے لئے بھیجے گئے۔ ساتھ ساتھ جہاد کی عملی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس وقت پنجاب میں سکھ شاہی کا زور تھا۔ مسلمانوں کی مسجدیں اور عبادت گاہیں ان کے تصرف میں تھیں۔ غریبوں کی آبرو بھی محفوظ نہیں رہی تھی۔ غرض مظالم کا ایک بے پناہ سیلاب تھا، جو پانچ دریاؤں کی مسلم آبادی کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں، مگر قوائے عمل مفلیج ہو چکے تھے۔ تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) کا آغاز مسلمانان ہند کے لئے مصیبت و ابتلا کی گھڑی تھی۔ یوں بھی یہاں کبھی اسلامی حکومت نہیں قائم ہوئی، مگر اب تو نام کی مسلمان حکومت کا بھی جنازہ کل رہا تھا یا نکل چکا تھا۔ جس ملک میں بادشاہ اور کشور کشا کی حیثیت سے صدیوں گلچن آڑتے رہے، اب اس کا چپہ چپہ ان کے خون کا پیا سا تھا۔ اور طرہ تو یہ کہ جس راہ وہ ہندستان داخل ہوئے تھے اور جہاں باہر سے آئی والی قومیں زیادہ تعداد میں آباد تھیں، خود وہاں کی زمین ان پر تنگ ہونے لگی۔ حالانکہ قرب و جوار میں مسلمان نام رکھنے والی چھوٹی بڑی ریاستیں اب بھی موجود تھیں۔ سرحد میں خونین کے مختلف گھرانے اپنی نسلی شرافت اور روایتی شجاعت پر بدستور نازاں تھے۔ لیکن کشور ہند کے طول و عرض میں اگر اللہ کا نام لے کر کوئی اٹھا، تو وہ چند سر بھیڑے "مولوی" اور ملائے "تھے۔ مندورس پر، قَالَ اللہُ اور قَالَ الرَّسُولُ کا گارٹنے والوں نے

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

۳۸

میدان کارزار میں مسند جہاد بچانے کی ٹھانی۔ یہ اللہ کے بے برگ و لوا بندے
صرف اسی کی رحمت و توفیق کے مجھرو سے پرسید احمد بریلویؒ کی قیادت میں
گھربار چھوڑ چل کھڑے ہوئے۔ خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ قرآن و
حدیث کا درس دینے والوں نے شمشیر زنی اور توپ افگنی کے خوب خوب
جوہر دکھائے۔ کامیابی و کامرانی ان کے ہر کامبختی۔ ظفر مندی قدم لینے کو آگے
بڑھی۔ پشاور کی سرزمین نے اطاعت میں سبقت کی۔ قریب تھا کہ سارا پنجاب
سرحد اسلامی نور سے جگمگانے لگتا اور ایک مرتبہ بچہ خلافت راشدہ کا عملی نمونہ
دنیا کے سامنے آجاتا، مگر ابھی مسلمانوں کے برے دن لکھے تھے۔ براہو نسلی
غریب اور قبائلی عصبیت کا جس نے اس تمام کئے کر ائے پر پانی پھیر دیا۔ کچھ
مجاہدین کی نا تجربہ کاری، کچھ علماء سوء کی تفریق انگیز حرکات اور سب پر
مستزاد، افغان سرداروں کی جاہلانہ عصبیت، ان سب چیزوں نے بل ملا کر
کایا پلٹ دی۔ خفیت و وہابیت کے جھگڑے الگ کھڑے ہو گئے۔
علماء سوء اور قریب رستوں نے مجاہدین امت پر کفر کے فتوے لگائے سرحد کے

۱۔ ایک صاحب علم دوست اس موقع پر نا تجربہ کاری کا استعمال صحیح نہیں سمجھتے۔ راقم نے پھر
غور کیا، لیکن اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس "نا کامی" میں "نا تجربہ کاری" کا بھی دخل ضروری تھا۔
مثال کے طور پر یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ افغانی قبائل میں مسلسل دعوت و
تبلیغ کے بعد زمین تیار کرنے سے پہلے ترعی حدود کو جاری کر دینا کوئی صحیح طریق کار نہیں تھا۔
اس طرح کی اور مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ داعی کو جوش و ولولہ کے ساتھ عبور و قتل سے بھی
آراستہ ہونا چاہیئے۔

خاندین نے اپنے مرشد اور محسن سے غباری کی..... نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہیدؒ نے
بالاکوٹ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ بھی دلی مراد پا گئے
بن کر دند خوش رہے بہ خاک و خون غلط دین

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۲۴ سیدی قعدہ ۱۲۴۳ھ یوم جمعہ (۱۸ مئی ۱۸۲۱ء) مشہدِ بالاکوٹ کا

ذکر ہے۔ خاتمہ لیے نوا! ادب سے سر جھکا اور عرض کر۔ بالاکوٹ کی سر زمین!!
تجھ پر اللہ کی ہزار ہزار رحمت، کہ تیری خاک میں امت کی بہترین آرزوئیں
اکسود ہو خواب ہیں۔

ایک طرف ان نفوسِ قاسیہ کی یہ قربانیاں اور فداکاریاں ہیں۔
اور دوسری طرف ہندستان کے قدر شناس مسلمانوں کی طرف سے تکفیر و
تفسیق کا صد سالہ لٹریچر جو بدایوں سے لے کر مدراس تک پھیلا یا گیا اور اب
تک پھیلا یا جا رہا ہے (گواہ تکفیر کی تلوار کند ہو چکی ہے) خالقِ ہوں میں
ہمیشہ گرجو گیوں کی طرح مالا جینے والے۔ سید احمدؒ اور اسماعیل شہیدؒ جیسے مجاہدین
امت پر کفر کے فتوے لگائیں مسلمانانِ ہند پر اس سے زیادہ اور کوئی منہج گھڑی
نہیں آئی۔ اور بڑھیلی یہ ہے کہ بد بختوں نے آج تک اللہ کے ان برگزیدہ

سید بالاکوٹ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے میں دادی کافغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے۔

۲۵ بعض دوستوں نے راتم کے لہجہ اور تلخی بیان کی شکایت کی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان
لوگوں کو بد بخت کسے سمجھا اور کیا کہا جائے جو ان بزرگوں کو گالیاں دے دے کر پورے
سویس سے اپنا نامہ اعمال سیاہ کر رہے ہیں۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ہندوؤں کو معاف نہیں کیا۔ مشہد بالا کوٹ کو آج سو برس سے اوپر ہو چکے ہیں، مگر ان پاک ارواح پر طعن و تشنیع کا سلسلہ جاری ہے۔

تغیر تو اے چرخ گرداں تھی

بالاکوٹ کی تربت میں آرام کرنے والو! تم پر اللہ کی رحمت اور سلام!

تمہاری ہڈیاں پھولوں میں رہیں اور اللہ تمہیں شہداء اور صالحین کی صف میں جگہ دے۔

اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ وَاحْشِرْهُمْ فِي زَمَرَةٍ الْمُهَاجِرِينَ وَالَّذِينَ

الذین ہاجروا وجاهدوا مع نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہم گنہگار ان کی مغفرت کے لئے کیا دعا کریں؟ شاید ان کے اعمال حسنہ کی یاد میں کچھ ہمارے گناہ بھی معاف ہو جائیں۔

سید صاحب کی دعوت خالص کتاب و سنت کی **دعوت اور مشن** دعوت تھی۔ بدعت و شرک کا مٹانا ان کا مشن

تھا۔ وہ دین محمدی میں عہد فاروقی کی پاکیزگی اور شوکت پیدا کرنا چاہتے

تھے۔ توحید خالص کی تبلیغ، قبر پرستی کا استیصال، مراۓ کم تعزیر کو بیخ و

بن سے اکھاڑ پھینکنا، اور نکاح بیوگان کی ترویج ان کی دعوت کے

اہم اجزاء تھے۔ ان کی دعوت کامیاب ہوئی یا ناکام؟ اس کے متعلق

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ زمانہ شاہد ہے، اور گزشتہ صدی کی تاریخ گواہ

ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس وقت تک اسلامی ہند میں جو کچھ اصلاح و تجدید

ہو سکتی ہے، سب کی سب سیّد شہیدؒ اور ان کے کفّش برداروں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کم سے کم پورب کے علاقوں میں روشنی کی جھلک سراسر اسی آفتابِ عمل کا فیض ہے۔ صادق پور (عظیم آباد) کا مشہور خاندان سیّد شہیدؒ اور ان کے ایک مرید مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) کی بدولت دنیائے عمل میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ اور ایک "پورب" پر کیا منحصر ہے، دلی، رام پور، جوینپور، روہیلکھنڈ، مدراس..... اس آفتابِ تجدید کی شعاعیں کہاں نہیں نہچیں؟

سیّد صاحبؒ اور ان کے خدام نے ملک کے طول و عرض میں جس طرح اصلاح و محو بدعات کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ سیکڑوں واقعات اب تک قلم بند نہیں ہو سکے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ والد ماجد مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مدظلہ (مولود ۱۲۹۰ھ) نے گزشتہ شوال (۱۳۶۳ھ) کے موقع پر زمانیہ (غازی پور) کے ایک غازی صاحبؒ کا بیان فرمایا تھا، اور اب خادم کی درخواست پر گرامی نامہ مورخہ ۱۹ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ میں اس کی تفصیل بھی کر دی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا، اگر گرامی نامہ پورا کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے:-

زمانیہ کے غازی صاحبؒ کے متعلق اتنا یاد ہے کہ اندازاً ۱۳۵۰ھ یا ۱۳۵۱ھ میں جس زمانے میں میری عمر بارہ سال کی ہوگی۔ ایک شخص غازی پور

۱۵ مشرقی پور۔ پی کے ضلع غازی پور کا ایک مشہور قصبہ

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

زمانہ کے رہنے والے، قد و قامت میں لمبے چوڑے، ضعیف العمر، مگر طاقت و قوت و دلیری میں جو انہوں کو مات کرتے تھے۔ تہی گذار، متبع سنت، مولوی کفر توڑ کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے ساتھ ایک موٹا عصا، جس میں بوسے کا پھل لگا ہوا تھا، ساتھ رکھتے تھے۔ اور کہتے کہ یہ کفر توڑ ہے۔ جہاں کہیں جاتے، ان کا کام یہ تھا کہ جہاں امام باڑہ کا چبوترہ دیکھتے، اسی کفر توڑ سے اکھاڑتے۔ جب وہ بنارس میں میری موجودگی میں پہنچے۔ تو مولوی محمد سعید صاحب مرحوم کے یہاں قیام کیا محلہ دارانگر کی مسجد میں (جس میں مولوی صاحب مع اپنے طلباء و متبعین کے نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے) صحن مسجد کے وسط میں ایک چبوترہ مربع تھا۔ جس پر تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ تین چار روز تک بڑا ہنگامہ رہتا تھا جب مولوی کفر توڑ صاحب پہنچے، تو انھوں نے اس چبوترے کو اکھیر کر پھینک دیا چونکہ اس محلے میں مولوی صاحب مرحوم کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے کچھ فساد نہیں ہوا۔ مولوی کفر توڑ صاحب مرحوم سید صاحب علیہ الرحمۃ سے سب سے کم سے کم ان کی عمر (۷۰ اور ۸۰) کے درمیان ہوتی ہے۔

۲۵ مولانا محمد سعید صاحب گنجابی بنارس (ف ۱۳۲۲ھ) تراجم علمائے حدیث

ہند۔ ۳۵۶-۳۵۳

۳۵ یہ محلہ دارانگر بنارس کی مسجد کا مال تھا۔ جہاں اہل حدیث حضرات کی اکثریت تھی۔ دوسری جگہوں کا جو مال ہوگا۔ اسی پر قیاس کر لیجئے۔ مولانا محمد فرماتے تھے کہ ان دنوں عام طور پر مسجدوں میں امام باڑے ہوا کرتے تھے۔ اور اچھے اچھے عالم کبھی اس پر ہاتھ رکھنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔

اور مولانا شہید علیہ الرحمۃ کے ساتھ جہاد میں برابر شریک رہے۔ بعد شہادت
سید صاحب کے وہ ہندستان اپنے وطن میں رہنے لگے۔ ان کے جسم مبارک پر
گولیوں اور نیزوں کے متعدد نشانات تھے، جس کو ہم لوگوں نے دیکھا۔ انہوں
نے ہم چند لڑکوں کو جن میں ہمارے اخ معظم مرحوم تھے۔ ایک روز تہجد کی
نماز پڑھائی اور دعا پڑھا تو رہ اللہم اجعل فی قلبی نوراً الخ لکھ کر
پڑھوائی، اور کہا کہ روزمرہ سویرے ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ اسی کا اثر تھا کہ
کافیہ، تہذیب، سلم، وغیرہ آسانی سے یاد کر لیتا تھا۔ اُس زمانے میں میں کافیہ
پڑھتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اسلامی ہند میں بنائے
تجدید کی ابتداء حضرت مجدد مسہ ہندی (ف ۱۰۲۰ھ) نے کی۔ اور تعمیر و
ترتیبین امام ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۰۰ھ) کے ہاتھوں سے ہوئی۔
مگر خاک و خون سے کھیلنا، تتمہ دودمان ولی اللہی مولانا اسماعیل شہید
(۱۱۹۶-۱۲۴۶ھ) کے لئے مقدر کیا گیا تھا۔ مولانا کے خیال میں تجدید و اصلاح
کی تکمیل اور مقام امامت کی صحیح عملی تفسیر حضرت شہید دہلوی نے کی ہے۔

سید الدار ماجد مولانا عبد الرشید کرمی نے اور غلام محمد مولانا عبد الرؤف صاحب مرحوم
دونوں نے اپنے بچہ بچی زاد بھائی مولانا سید عبدالکبیر صاحب بہاری (ف ۱۳۳۱ھ
تراجم علماۃ حدیث، ص ۲۶۳-۲۶۴) کی نگرانی اور سرپرستی میں دارانگر، بنارس میں ابتدائی
تعلیم حاصل کی اور تکمیل کانپور اور علی گڑھ میں کی۔

مولانا آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں، مولانا شہیدؒ ہی کی روح کا رفرمانظر آتی ہے۔ استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ دونوں بزرگوں کو تجدید دین کی تحریک کا امام سمجھتے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ شہیدینؒ کو امام ولی اللہ کی تجدید کا متمہ سمجھتے ہیں۔ راقم کو مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ اور ان دونوں بزرگوں سے تھوڑا سا مودبانہ اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک مجدد مسرہندیؒ اور امام ولی اللہ دہلویؒ کی تیار کردہ عمارت کی تکمیل حضرت شہید دہلویؒ کے پیرومرشد حضرت سید شہید بریلویؒ کی ذات گرامی سے ہوئی ہے۔ اپنا اپنا تاثر اور اپنا اپنا وجدان ہے۔

وللناس فی ما یعشقون مذاہب

راقم نے خود مولانا آزاد کی خدمت میں ایک موقع پر (لکھنؤ کانگریس ۱۹۳۷ء) اپنا خیال پیش کیا تھا۔ مولانا نے جواب دیا۔ کہ میرا ذاتی تاثر وہی ہے۔ "بہر حال اگر مرید و عقیدتمند ہی کی قسمت میں یہ بلند مرتبہ تھا، تو پیرومرشد کے مراتب عالیہ کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟"

دعوت کا اہم عنصر | سید صاحب کی دعوت کا اہم عنصر حبسِ ادنیٰ فی سبیل اللہ ہے، اور یہی چیز اس تحریک تجدید و جہاد کو نجد کی دعوت توحید سے خاص طور پر ممتاز کرتی ہے۔ سید صاحبؒ کا

۱۔ مقدمہ سیرت سید احمد شہید ۲۔ تجدید و احیائے دین ص ۶۹ - ۷۰

۳۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتاب "مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر" ص ۳۵ - ۳۶

کوئی وعظ یا مکتوب ترغیب جہاد سے خالی نہیں ہوتا۔ انھوں نے صرف وعظ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے مریدوں کے ساتھ گھر بار چھوڑ کر سرحد شریف لے گئے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ سکھوں کے مظالم ان کے سامنے تھے۔ مسلمان عورتوں کی عصمت و آبرو محفوظ نہیں رہی تھی۔ ان کا خون حلال ہو چکا تھا۔ گلے کی قربانی ممنوع تھی۔ مسجدوں سے اطمینان کا کام لیا جا رہا تھا۔ غرض وہاں وہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ جس کی طرف اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:-

خالصہ شمشیر و تیراں را ببرد

اندر آں کشور مسلمانانی ببرد

انھیں حالات سے متاثر ہو کر سید صاحبؒ نے باضابطہ جہاد کا اعلان

کیا۔ سکھوں کو پہلے اسلام کی دعوت دی۔ پھر معرکہ آرائی شروع ہوئی۔

حیدر کا رخ کیا، کامیابی قدم لینے کو آگے بڑھی۔ سید صاحبؒ کی قوت روز

بروز بڑھتی گئی۔ مجاہدین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی امارت کا اعلان ہوا۔

۱۲۴۲ھ خطبوں میں آپ کا نام پڑھا جانے لگا۔ دور اور نزدیک سے

۱۳۴۲ھ ہم کہیں اور پر لکھ آئے ہیں کہ سید صاحبؒ کے دل میں جذبہ جہاد بدو شعور ہی سے پرورش پا رہا

تھا۔ اور آگے بڑھ کر اقامت دین کا مقصد بلند ان کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ ان کی دور

بین نگاہوں سے یہ بات بھی اوجھل نہیں تھی کہ اصل خطرہ کہاں ہے اور جہاد کی ہم کا صحیح رخ کیا ہونا چاہیے

لیکن موقع جنگ اور پنجاب کے حالات نے انھیں پہلے سکھوں سے نبٹ لینے پر مجبور کر دیا۔ یہ

اور بات ہے کہ اصل حریف سے پنجہ آزمائی سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی ہوئی۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اطاعت اور معاونت کے پیام آنے لگے۔ . . . مگر بہارے بعضے بزرگ کہتے ہیں کہ ”یہ بیعت امارت“ ڈکٹیٹر شپ کا اعلان تھی اور مجاہدین نے سید صاحب کے دست مبارک پر امامت کی بیعت کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ راقم عرض کرتا ہے، کہ اگر سید صاحب کی امارت ڈکٹیٹر شپ تھی، تو پھوخیں (ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ) کی خلافت بھی ڈکٹیٹر شپ تھی اور اگر یہ بیعت کوئی غلط چیز ہے تو اس سے پہلے صحابہ کرامؓ نے بھی اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ آخر ہم ساحرانِ فرنگ کی ابلہ فریبیوں کا کب تک شکار بنے رہیں گے؟

عرض یہ کر رہا تھا کہ سید صاحب کی امامت و امارت پر باضابطہ بیعت ہوئی (۱۲ جمادی الآخرۃ ۱۲۴۲ھ ۱۱ جنوری ۱۸۲۶ء) اور ہند، و بیرون ہند کے اہل نظر و فکر نے اس کی دلی تائید کی۔ لیکن اپنی بد نصیبی کا ماتم کن لفظوں میں کیا جائے؟ دل میں ایک ہلکے اٹھتی ہے اور آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، جب کہ بھی ملائوں کے فتوے اور خوانین سرحد کی غداری یاد آتی ہے۔ مگر یہاں توجہ کی گڑا کر کے کسی نہ کسی طرح ”وداد الم قلمبند“ کرنا ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے کہ جاہل ملائوں نے مجاہدین کو وہابی کہنا شروع کیا۔ جن کی اصلاح و بہبودی اور امداد و معاونت کے لئے اس بے برگ و بار

سید زادے اور اس کے جان نثاروں نے ہجرت کی مشقیں گوارا کیں، وہ خود جان کے دشمن ہو گئے۔ کھانے میں زہر بھی دیا گیا۔ پشاور فتح ہو چکا تھا۔ مگر سردارانِ پشاور کی غداری کے باعث سید صاحب کے مقرر کردہ عمال اور خاص اصحاب کا قتل عام ہوا۔ اور پھر اتنی بد دلی ہوئی کہ وہ نواحِ پشاور کو چھوڑ کر۔ راج دھاری کی وادی کو منتقل ہو گئے (شعبان ۱۲۴۶ھ) وہاں بھی سکھوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ آخر بالآخر کوٹ میں وہ آخری معرکہ پیش آیا جس کا اجمالی تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ مقامی خوانین ذاتی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان میں سے ایک جماعت سید صاحب کے ساتھ تھی۔ اور کچھ لوگ سکھوں کے مددگار و معاون رہے۔ سکھوں کے ان مقامی ہمدردوں کو تمام راستوں اور پڑیچ گھاٹیوں کا پورا پورا علم تھا۔ انھیں کی نشان دہی کی بدولت اس آخری معرکہ میں سکھوں کو ناگہانی طور پر عقب سے حملہ آور ہونے کا موقع مل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مجاہدینِ جان پر کھیل کر لڑے۔ موت سامنے تھی اور شہادت کی آرزو دلوں میں بسی ہوئی۔ لڑے اور اس طرح کہ دشت و جبل نعرۂ حق سے گونج اٹھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی بالاکوٹ کے ارد گرد اس نعرۂ حق کی گونج نہیں سنائی دیتی ہوگی؟۔ ۵۔

ہرگز نہ میر و آنکہ دلش زندہ شد عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا اسماعیل شہید اور خود سید صاحب نے بھی اسی معرکہ میں جامِ شہاد

نوٹس فرمایا۔ (۲۴ رذی قعدہ ۱۲۴۷ھ)

شہادت یا غیبت ابلا کوٹ کا حادثہ کچھ اس طرح پیش آیا، کہ شہدا کی تجہیز و تکفین بھی غیروں ہی نے کی۔ ان کی قبروں کا بھی ٹھیک ٹھیک علم نہیں۔ خود سید صاحبؒ نے بعض ایسی پیش گوئیاں کی تھیں، جن سے بعض کمزور دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ سید صاحبؒ شہید نہیں ہوئے، بلکہ نکاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، اور دوبارہ ظاہر ہو کر دنیا کو شرک و بدعت سے پاک کریں گے۔ یہ خیال ایک عرصہ تک سید صاحبؒ کے عقیدت مندان خاص کے دلوں میں جاگزیں رہا۔ اسی انتظار میں کتنے بیٹھے رہے اور بے نیل و مرام اس دنیا سے اٹھ گئے۔ سید صاحبؒ کے عقیدت مندوں اور ان کے نقش قدم پر گمراہ اٹھانے والوں کا سب سے بڑا "قافلہ"، صادق پور (پٹنہ) میں آباد تھا۔ (وہ چمن تو ۱۸۶۵ء کی خزاں میں

۱۔ خاندان صادق پور کے خاندانی مکان کو عرف عام میں "قافلہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔
 ۲۔ صادق پور، شہر عظیم آباد، پٹنہ کا ایک محلہ ہے۔ اس کی آبادی پرانے شہر (موجودہ پٹنہ سٹی) کے مغربی دروازہ سے بالکل ملی ہوئی ہے، یہاں شرقاٹے بنو ہاشم کا ایک مشہور خاندان عرصہ دراز سے آباد ہے۔ جو علمی وقار اور دینی وجاہت ہر لحاظ سے دور و نزدیک عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی خاندان کے گوہر شہب چرخ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) تھے، جو زانا طالب علی ہی میں لکھنؤ میں سید صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور پھر سارے خاندان کو اس راہ کا مسافر بنادیا۔ جس مقام پر ان کا پرانا عالی شان مکان (جو دعوت جہاد کا عرصہ دراز تک مرکز رہا ہے اور اسی مناسبت سے قافلہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) تھا، اب وہاں پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت قائم ہے۔
 ۳۔ اب یہ سوال کہ پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت کس طرح تعمیر ہوئی؟ اور اس عالی شان محل کا نام و نشان بھی آج کیوں نہیں ملتا؟ اس کا جواب آئندہ صفحات میں کچھ مل سکے گا۔

اُجڑ چکا۔ مگر اس کی نشانیاں "آشیانے" کے ارد گرد باقی ہیں اور ان کی اولاد اب تک وہیں مقیم ہے) ان میں یہ خیال عرصہ دراز تک قائم رہا۔ بعض بڑے مخلص اور متبع سنت علماء اس "توہم" کے شکار ہوئے۔ اور شاید اب بھی ان کے دلوں سے یہ عقیدہ نہیں نکل سکا ہے۔ گو درایت و عقل کی رو سے وہ سید صاحبؒ کی شہادت کو تسلیم کرتے ہیں۔

— یہ فرط محبت کی لغزش تھی۔ گو لغزش بہر حال لغزش ہے۔ اور یہ کوئی معمولی لغزش نہیں، پھر بھی ان کے حالات پر نظر رکھ کر زبان طعن دراز کرنے سے پہلے ذرا سوچ لینا چاہیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ (جو مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی صادق پوریؒ ف ۱۳۱۴ھ کی صحبت میں عرصے تک رہے اور اس لئے اہل صادق پور کے احوال و کیفیات سے اچھی طرح واقف ہیں) کا تاثر یہ ہے کہ گرتے ہوئے دلوں کو "تھامنے" کے لئے یہ شوشہ چھوڑا گیا تھا۔ ہم نے ابھی کہا ہے کہ لغزش بہر حال لغزش ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سچے اور بے ریا لوگوں پر افترا اور بہتان تراشا جائے۔

"حکمت ولی اللہی" کے علم بردار مولانا عبید اللہ سندھی (ف ۱۳۶۳ھ) نے مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) اور ان کے دوسرے شاہ یہ مولانا یحییٰ علی (اسیرانڈمان) کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ان کی گرفتاری کے وقت (۱۸۶۴ھ) مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ کے تھے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

رفیقوں اور ماننے والوں کو شیعیت اور زیدیت کا نام لگا کر جس طرح
مطعون اور بدنام کرنے کی ناکرواکوشش کی ہے، اسے تحریک تجدید و
جہاد کا مؤرخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہم مولانا سندھی کی قربانیوں
اور علم و فضل کا انکار نہیں کرتے، بلکہ سچے دل سے ان کا اعتراف کرتے ہیں
لیکن سید شہیدؒ اور ان کے اصحاب باصفا پر منہ آنا ان کو زیب نہیں دیتا
اور اگر قربانیوں اور فداکاریوں، کے طفیل مولانا سندھی کی لغزشیں قابل
درگزر ہیں (جیسا کہ ان کے ایک عقیدت مند نے لکھا ہے) تو پھر سید
شہیدؒ کے اصحاب خاص کی فرو گذاشتیں اور بھی زیادہ قابل درگزر ہوں گی؟
کیا وہ اور ان کے معتقدین ان مجاہدین راہ حق کی قربانیوں اور فداکاریوں
سے بے خبر ہیں؟

اصلی نصب العین تائیں حکومت الہیہ ^{اچھے دو تین برسوں میں} حضرت سید شہیدؒ اور ان کی

تحریک تجدید و جہاد، کے متعلق جہاں اور غلط بیانیوں کی گئی ہیں وہاں
یہ بھی کہا گیا ہے کہ سید صاحبؒ کی جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو
دور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی تھی۔ حالانکہ سید صاحبؒ اور ان کے مقصد

۱۱۲-۱۶۵-۱۶۱-۱۵۹ء شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

اور راقم کی کتابوں میں... سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر: ص ۶-۷

۱۱۲-۱۶۵-۱۶۱-۱۵۹ء شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۷ اور مولانا سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر ص ۱۱-۱۲

جہاد کی اس سے زیادہ اور کوئی تنقیص نہیں ہو سکتی۔ سید صاحب مکمل اسلامی نظام کے داعی تھے۔ دہلی کی حکومت کو ان کے بلند مقاصد سے کیا نسبت؟ کون نہیں جانتا کہ دہلی کی حکومت خاندانی شخصی حکومت تھی۔ اور خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الہی کی تاسیس کرنا سید صاحب کا نصب العین تھا۔ سید صاحب کا مقصد و نصب العین اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونا چاہئے تھی۔ ان کا جہاد ظاہری اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لئے تھا۔ یہ موافق و مخالف سب پر عیاں ہے، مگر جب ایک غلط بیانی علم و تحقیق کا جامہ پہن کر منظر عام پر آچکی ہے، تو اس کی صاف و واضح تردید بھی ضروری ہے۔ لیجئے جہاد و ہجرت اور نصب امامت کا مقصد عالی خود سید صاحب کی زبان سے سنئے۔ سردار سلطان محمد خاں اور سردار سعید محمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:-

رب غمخور کہ علیم بذات الصدور است	رب غمخور جو کہ دلوں کا حال چھیڑ چھا جانتا ہے
آگاہ است برائیں معنی کہ ایں جانب	اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس
را از قبول ایں منصب غیر	منصب (امامت) کے قبول کرنے
از اقامت جہاد بروجہ مشروع	سے اس کے سوا میری کوئی دوسری
و حصول معنی انتظام در عسا کر اہل	فہمائی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا
اسلام غرض دیگر از اغراض نفسانیہ	جائے اور ملانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو۔
نیست آرزے ایں قدر آرز و دارم	ہاں اس قدر آرز و رکھتا ہوں

کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع
اقطار عالم احکام رب العالمین
کہ کسبھی بہ شرع متین است، بلا
منازعہت احدے نافذ گردد۔
کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک میں
رب العالمین کے احکام جن کا نام
شرع متین ہے، بلا کسی کی مخالفت
کے جاری ہو جائیں۔

(سیرت سید احمد شہید: ص ۱۱۱-۱۱۰)

کیا اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ سید صاحب دہلی کی حکومت کی کمزوری
دور کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے؟

سید صاحب کے دست مبارک پر بے شمار علماء نے جہاد و
مشہور خلفاء اصلاح کی بیعت کی۔ ایک اچھی خاصی تعداد سرحد و
پنجاب کے معرکوں میں کام آئی۔ دوسروں نے شرک و بدعت کے مٹانے
میں بڑی نمایاں خدمتیں انجام دیں۔ اور بلاشبہ آج اسلامی ہند میں جو کچھ
صحیح النجالی اور اتباع "سنت" کا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ ان ہی ارباب
صدق و صفا کی کوششوں کا رہین منت ہے۔

یوں تو خلفاء کی تعداد بہت ہے، لیکن ان میں مشہور ترین اصحاب کے
نام یہ ہیں:-

(۱) مولانا عبدالحی بڈھانی (ف ۱۲۳۳ھ) (۲) مولانا اسماعیل شہید (ش ۱۲۳۶ھ)

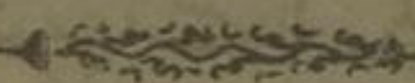
۱۵ مزید تفصیل کے لئے:- سیرت سید احمد شہید (ص ۱۵۹-۱۵۸) ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

- (۳) مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) (۴) مولانا محمد علی
رام پوری (ف ۱۲۵۰ھ) (۵) مولانا سخاوت علی جوہر پوری (ف ۱۲۵۰ھ)
(۶) مولانا کرامت علی جون پوری (ف ۱۲۹۰ھ)

ان میں مولانا عبدالحی داماد مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے
پیر و مرشد کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ مولانا اسماعیل نے بالاکوٹ
میں اپنے پیر اور امیر کا حق رفاقت ادا کیا۔ مولانا سخاوت علی (م ۱۲۲۶ھ)
اور مولانا کرامت علی (م ۱۲۱۵ھ) نسبتاً کم عمر تھے۔ مولانا سخاوت علی
نے مکہ معظمہ کو ہجرت کی، اور وہ بڑی حد تک اپنے شیخ کے مسلک اور طریقے پر
قائم رہے، مولانا کرامت علی (ف ۱۲۹۰ھ) نے بڑی عمر پائی۔ اور بنگال میں
ایک عرصے تک وہ تبلیغی دورے کرتے رہے، مگر ان کی روش اپنے شیخ اور ان
کے اصحاب خاص کے مشرب سے الگ ہو گئی تھی۔ رہ گئے۔ مولانا محمد علی

سید مجاہدین اور اتباع سید احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار مشرجمین جنٹلی J. okinley
نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے موٹو اور دوہائیوں کے پکے مخالف
Persistent Opponent of Wahabia تھے۔ یہ تصدیق
نامہ راج محل (بہار) میں ۳۱ اکتوبر ۱۸۶۰ء کو دیا گیا تھا۔ جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ طور پر ۱۹۱۸ء
میں طبع کرایا تھا (وہ خوبصورت اور نظر فریب بفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے
مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے ان
کے علاوہ راقم بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے
بالکل الگ تھے۔ سیرت سید احمد شہید (جمع دوم ص ۳۴۰-۳۴۲) کے بیانات سے غلط فہمی کا
اندیشہ ہے۔ اس لئے راقم نے ضروری خیال کیا کہ حقیقت واضح کر دی جائے۔

رام پوری اور مولانا ولایت علی صادق پوری۔ ان دونوں بزرگوں کو
 خود سید صاحب نے میدانِ جہاد ہی سے مدراس اور دکن تبلیغی مہم پر
 بھیج دیا تھا۔ اور دونوں نے اپنے فرائض سچے جوش اور ولولے کے ساتھ
 انجام دیئے۔ شہادت کی خبر ان دونوں بزرگوں کو علی الترتیب مدراس
 اور دکن ہی میں ملی۔ اس کے بعد مولانا محمد علی وطن کو لوٹ آئے، پھر
 دوبارہ مدراس تشریف لے گئے (۱۲۵۱ھ) اور وہاں آپ کو علماء
 سوء اور بدعت نواز مسلمانوں نے بڑی تکلیفیں دیں۔ اس لئے دوسری
 مرتبہ وہاں زیادہ قیام نہ ہو سکا، اور واپس چلے آئے (اواخر ۱۲۵۲ھ)
 اپنی عمر کے آخر چھ سال آپ نے تذکیر و تبلیغ میں صرف کئے اور ۱۲۵۶ھ
 میں وفات پائی۔



چوتھا باب

سید صاحب کے بعد

مولانا ولایت علی صادق پوری

ایچی اور پرگزر چکا ہے کہ حادثہ
بالاکوٹ کے وقت سید شہید
کے دو بڑے اور ممتاز رفیق مدراس اور دکن میں تبلیغی خدمات پر مامور تھے
مشیت الہی ہی تھی کہ سید صاحب کے بعد جی آگ و خون کی ہولی کھیلی جاتی
رہے۔ میدان جہاد سے ان دونوں بزرگوں کی دوری اور سلامتی میں ہی
راز پنہاں معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال مولانا محمد علی رام پوری (ف ۱۲۵۶ھ)
فاجعہ شہادت (۱۲۶۶ھ) کے بعد بارہ سال تک خاموش طریقہ سے تبلیغ
و اصلاح کے مفید کام کرتے رہے، مگر وہ کہ جس کے کندھوں پر سید شہید کی
جانشینی کا بار پڑ گیا تھا، اس کی روش اس خاموش طریقہ تبلیغ سے الگ

مولانا ولایت علی صاحب پر میدان جہاد سے علیحدگی اور سید صاحب کی جدائی
بہت شاق تھی۔ سید صاحب نے آپ سے فرمایا کہ مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے
ہیں یعنی اس ایک تخم سے ہزاروں درخت پیدا ہوں گے۔

رہی۔ فاجعہ بالا کوٹ کے بعد تمام ملک پر آداسی چھائی ہوئی تھی۔
 جماعت تتر بتر ہو گئی۔ اچھوں اچھوں کے قدم لڑ کھڑا رہے تھے۔ جہاد کا
 سارا کام درہم برہم ہوا چاہتا تھا، کہ عظیم آباد، پٹنہ محلہ صادق پور کے ایک
 فرد نے یہ گرتا ہوا علم اپنے ہاتھوں سے تھام لیا اور زندگی بھر اپنے سینوں سے
 لگائے رکھا۔ اور پھر اس "فرد کامل" کے بعد اس کے بھائیوں، بھتیجیوں،
 عزیزوں اور ماننے والوں نے جس طرح اپنے خون سے اس نخل خزاں دیدہ
 کی آبیاری کی ہے، وہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے
 افسوس کہ ولیم ولسن ہنٹر W. W. Hunter کی گمراہ کن اور اشتعال
 انگیز کتاب ہندستانی مسلمانان The Indian Musalmans کے سوا
 ان کشتگان خنجر تسلیم کے متعلق اور کوئی چیز اردو میں نہیں آئی۔ مولانا عبد الرحیم
 صاحب صادق پوری (مولود ۱۲۵۲ھ - اسیرانڈمان ۱۸۶۲ھ - ۱۸۶۳ھ)
 جیل ۱۸۶۳ھ، متوفی در عظیم آباد ۱۳۴۲ھ) کی تذکرہ صادق، مولوی محمد جعفر

۱۵۱۸ھ مغفرت کرے، مولوی طفیل احمد صاحب مرحوم نے ہنٹر کی کتاب کے اتنے اقتباسات اپنی
 کتابوں میں دیئے اور ایک مشہور عالم نے اپنی تقریروں میں اس کثرت سے اس کے حوالے پیش
 کئے کہ عام طور پر لوگوں کو اس دریدہ دہن مصنف اور اس کی کتاب سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے
 حالانکہ یہ کتاب اس قدر کیستحق نہیں تھی۔ نہ اس کی تحقیق ہی اپنی ہے اور نہ اس کی زبان ہی شائستہ
 ہے۔ اس کی تہذیب و شائستگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سید شہید کو "ڈاکو"
 (Robber) رنہزن (Bandit) اور فری Imposter

کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ (نیا ادیشن ص ۴، ۵، ۶)

صاحب تحفانیسری (اسیرانڈمان متوفی ۱۹۰۵ء) کی تواریخ عجیب میں
 بلکمرے ہوئے معلومات ملتے ہیں۔ مگر ان کتابوں کو اب پڑھنا کون ہے؟
 مولانا ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں انہیں ماخذ سے لے کر
 اچھی خاصی مرتب اور مسلسل روداد الم قلم بند کر دی ہے، مگر انسو کے ان چند
 قطروں سے اس پاک اور طاہر خون کا حق تو ادا نہیں ہو سکتا، جو مسلسل
 نشو و نما (۱۸۳۱ء - ۱۹۳۴ء) بنگال کے مشرقی اضلاع سے لے کر
 سرحد اور ماورائے سرحد کی پتھریلی اور پیاسی زمینوں تک بے دریغ
 بہایا گیا۔ حق یہ ہے کہ ان بلاکشانِ راہِ عزیمت کا ادنیٰ حق بھی اب تک
 ادا نہیں ہو سکا ہے۔

راقم کا کچھ عجیب حال ہے، جہاں مجاہدین راہِ حق کا ذکر آیا، وہ تمام
 ”اگلی اور پچھلی“ بے انصافیاں اور غلط بیابیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتی
 ہیں، جو اربابِ ہوا و ہوس نے ان بزرگوں کے متعلق روارکھیں۔ اور
 راہوار قلم بے قابو ہونے لگتا ہے۔۔۔ بہر حال عرض یہ کرنا تھا کہ مشہدِ بالا
 کوٹ (۱۲۴۱ھ) پر سید صاحب کی شروع کی ہوئی تحریک تجارید و جہاد
 بالکل ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ سید صاحب کی شہادت کے بعد قیادت
 کی باگ مولانا ولایت علی صادق پوری عظیم آبادی (مولود ۱۲۰۵ھ)
 نے اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ابھی وہ دکن میں تبلیغ و ارشاد کے فرائض انجام
 دے رہے تھے کہ بعد ہی مجاہدین کا ایک گروہ سرحد پار (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۸) *
 * * * * *

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

دے رہے تھے کہ فاجعہ بالاکوٹ پیش آیا۔ امیر و شیخ کی شہادت کی خبر سنتے ہی وہ عظیم آباد واپس ہوئے اور دعوت و تبلیغ کی از سر نو تنظیم شروع کی۔ بنگال، بہار و کن، مدراس، مختلف صوبوں کو مبلغ بھیجے۔ رو بدعت پر متعدد کتابیں شائع کیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خاندان میں عمل بالسنت کی تجدید کی۔ صوبہ بہار و بنگال میں نکاح بیوگان کا آغاز آپ ہی کے خاندان سے ہوا، جس طرح ہندستان میں نکاح بیوگان کی پہلی مثال خود سید شہیدؒ نے اپنے خاندان میں قائم کی تھی۔ اس نکاح کا بڑا شور و غل رہا پھر بڑے حضرت (مولانا ولایت علی صاحبؒ) اپنے خاص حلقوں میں اسی

(حاشیہ بقایا صفحہ ۵) پہنچ گیا تھا۔ اور مولانا ولایت علیؒ کے سرحد پہنچنے (۱۸۶۶ء) سے پہلے وہ مختلف امراء (شیخ ولی محمد بھلتی، مولوی نصیر الدین دہلوی اور حاجی سید عبدالرحیم سورتی، اور مولانا عنایت علیؒ) کی سرکردگی میں اپنا فرض انجام دیتے رہے۔ لیکن اندرون ہند و بیرون ہند مجاہدین اور ان کے ہمدرد انھیں کو اپنا امیر سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے جب وہ سرحد پہنچ گئے تو مرابطین نے فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ باقی ملک کے اندر تو وہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی سے امیر کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

۱۵ مولانا ولایت علیؒ نے سنت پہلے پہل خود اپنی ذات سے زندہ کی۔ مولوی الہی بخش صاحب جعفریؒ صادق پوری (۱۲۰۱ھ - ۱۲۷۵ھ) نے اپنی بیوہ لڑکی ہمایہ جمیلۃ النساء (جن کے شوہر مولوی محمد الدین جہاد سرحد میں معرکہ بالاکوٹ سے چھ ماہ پیشتر شہید ہو چکے تھے) کا عقد آپ سے کر دیا۔ مولانا کے چھوٹے بیٹے مولوی محمد حسن ذبیح دف (۱۲۸۵ھ - ۱۳۱۵ھ) جنہوں نے سولہ سال کی عمر میں اسیران بلا (۱۸۶۳ء) کے مقدمات کی محیر العقول طریقے پر بیرونی کی۔ اسی

ایٹن سے پیدا ہوئے (۱۲۶۴ھ)

لقب سے یاد کئے جاتے ہیں) نے اس سنت کو خوب چاہی کیا اور ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح کرا دیئے۔

آپ کی ذات سے جو احیائے سنت ہوا۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ عہد حاضر کے ”روشن خیال“ حضرات کو یہ چیزیں معمولی اور حقیر معلوم ہونگی۔ لیکن جب آپ آج سے سو برس پہلے کے حالات کا تصور کریں گے، تو ان کی اہمیت معلوم ہوگی اور ان علماء حق کی جرأت اور جذبہ اتباع سنت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اگر یہ چیزیں ”اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت سے الگ، صرف جزوی اصلاح کی حیثیت سے کی جائیں، تو یقینی زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، مگر جب اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت کے ساتھ اقامت دین کی تحریک کے ضمن میں یہ اصلاحات بھی ہوتی جائیں، تو بڑی بات ہے۔

ان بزرگوں نے یہ سنتیں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے زندہ کی تھیں اور ہمارا یہ حال ہے کہ آج بھی ہماری زندگی ہندوانہ رسوم سے پاک نہیں ہو سکی ہے۔ نکاح بیوگان کے علاوہ اور جن سنتوں کا احیا مولانا ولایت علیؒ کے دم قدم سے ہوا، ان کا مختصر ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

(۱) مولوی اکبر علی فرزند مولوی الہی بخش صاحب جعفری (ف ۱۲۵۵ھ) کا

ہیضہ میں انتقال ہوا۔ تو ان کی بیوہ اہلیہ (بنت شاہ محمد حسین صاحب ف ۱۲۵۵ھ) کاغاثبانیہ نکاح اپنے منجھلے بھائی مولوی عنایت علی صاحب

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

غازی سے کر کے نیک بی بی کو ان کے پاس بنگال بھیج دیا۔ جہاں وہ تبلیغ و ارشاد میں مصروف تھے۔ جیسے نجاشی (بادشاہ حبشہ) نے ام المومنین ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان کا نکاح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر کے مدینہ منورہ بھیج دیا تھا۔ (اس خاندان میں یہ دوسرا نکاح ثانی تھا)

(۲) ایک شخص عبد الغنی نگر ہنسوی (جو زمرہ مساکین سے تھے) کا عقد ایک بیوہ عورت سے تعلیم قرآن مہر قرار دے کر کر دیا۔

(۳) شرفائے بہار میں تعداد ازواج معیوب تھا (اور آج بھی معیوب سمجھا جاتا ہے) اور ایک بیوی کے ہوتے ہوئے برابر کی جوڑ میں دوسرا نکاح کرنا تو گویا حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے خاندان میں ایسی دو شادیاں کرائیں اور ان میں تمام برادری اور عقیدت مندوں کو دعوت دے کر اتباع سنت کی ترغیب دی۔

(۴) آپ نے اپنے دو صاحبزادوں مولوی عبداللہ اور مولوی ہدایت اللہ کا عقد نکاح اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) کی دو لڑکیوں کے ساتھ اس سادگی کے ساتھ انجام دیا کہ گھر کے موجودہ کپڑے (وہ بھی پیوند لگے ہوئے) پہنا دیئے اور کوئی نیا کپڑا دلہا دلہن کے لئے تیار نہیں کرایا گیا۔ آپ نے یہ سنت بھی پانچ ہزار آدمیوں کے مجمع میں ادا کی۔

تنظیم و تبلیغ تنظیم و تبلیغ کے سلسلے میں مندرجہ ذیل انتظامات خاص طور پر قابل ذکر ہیں :-

(۱) شاہ محمد حسین صاحب (ف ۱۲۳۷ھ) خلیفہ حضرت سید صاحب کو

مسجد نمبر ۱۱ (صادق پور سے متصل شہر پٹنہ کا ایک محلہ) ... یہ مسجد آج تک اسی خاندان کی نگرانی میں ہے، کا امام اور چھپرہ، متفکر پور اور بہار کے دوسرے اصلاخ میں تلقین و ہدایت کے لئے مقرر کیا۔

(۲) اپنے منجملے بھائی مولانا عنایت علی غازی (ف ۱۲۵۸ھ) کو

اہل بنگال کے ارشاد و ہدایت کے لئے روانہ کیا۔ (۳) مولوی زین العابدین

اور مولوی محمد عباس حیدر آبادی کو اڑیسہ اور صوبہ الہ آباد (موجودہ یوپی کے

مشرقی اضلاع) کی طرف عام تبلیغ کے لئے بھیجا۔ (۴) شہر پٹنہ، نواب

فخر الدولہ کی مسجد میں دوسرا جمعہ قائم کیا، جہاں ہر جمعہ خود وعظ فرماتے۔

(۵) دینیات کی تعلیم کے لئے گھر پر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن و حدیث کا

درس دیتے۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۷ھ) قاری

ہوتے۔ دوسرے علماء تفسیر کی کتابیں ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ

عام مریدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی۔ قرآن مجید اور

بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے۔

(۶) شاہ محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) سے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ

قرآن اور مولانا شہید کے رسائل منگوا کر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں طبع کرانے کی

کوشش کی۔ مالک مطبع کے انکار پر، آپ نے یہ خدمت اپنے ایک

رفیق و عقیدت مند مولوی بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی،

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

جنہوں نے خاص طور پر ایک ٹائپ پریس خرید کر کے پہلی مرتبہ یہ کتابیں چھپوائیں
تبلیغ و تذکیر کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا ولایت علیؒ کا
وعظ بہت پُر اثر ہوتا۔ نواب صدیق حسن خاں (دف ستمبر ۱۹۰۷ء) نے ان کے
قنوج آنے اور وعظ کی تاثیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے
”بلوغ المرام“ کی شرح مولاناؒ کی ترغیب سے لکھی تھی۔ نواب صاحب فرماتے
ہیں :-

..... پھر مولوی ولایت علی، مولوی عنایت علی قنوج میں تشریف
لائے۔ میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہل بیت کو واسطے ملاقات والدہ مرحومہ
کے بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کیا۔ مجھ سے کہ گئے کہ تم
کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا
اُس کہنے کا نتیجہ بعد ایک مدت دراز کے یہ ظاہر ہوا کہ میں نے بلوغ المرام کی
شرح لکھی۔ جو اثر سریع میں نے وعظ مولوی عنایت علی مرحوم میں پایا،
وہ کسی میں نہ دیکھا نہ سنا۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے دل دُنیا سے سُرود ہو جاتا
تھا اور دین کا جوش تہ دل سے اٹھتا تھا۔ یہ مصرع میں نے انہیں سے یاد کر لیا تھا۔
ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

مولانا ولایت علیؒ خود بھی بنگال تشریف لے گئے۔ شہروں
حج و جہاد اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ پھر اپنے مرشد و امیر کی اتباع میں

آغاز جہاد سے پہلے حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اسی سلسلے میں یمن اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی۔ اور یمن کے نامور محدث و عالم قاضی محمد بن علی شوکانیؒ کو فحشۃً حدیث کی سند حاصل کی۔ اور ان کی بعض تصانیف ساتھ لائے۔ ان کی یہی اداہمارے مولانا سندھیؒ کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ پتہ نہیں، بیرون ہند کے کسی عالم اور محدث سے استفادہ کیوں جرم قرار دیا جاتا ہے؟ اسلام تو اس قسم کی ملکی اور وطنی حد بندی کا قائل نہیں۔

والہی کے بعد اپنے سگے بھائی مولانا عنایت علی غازیؒ کو سید ضامن شاہ (جو کاغان کے رہنے والے اور ان دنوں سکھوں سے برسرِ پیکار تھے) کی طلب پر مقام جہاد کی طرف روانہ کیا۔ پھر خود بالاکوٹ پہنچے اور مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

۱۔ الدرر البہرۃ کا نسخہ جو مولانا ولایت علیؒ یمن سے ساتھ لائے تھے، اب تک صادق پور میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کی نظر سے گزر چکا ہے۔
۲۔ ملاحظہ ہو۔ مولانا سندھیؒ اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر ص ۸۷۔
۳۔ ایک نادر قلمی رسالے میں جو ذیقعدہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) کو میدان جہاد سے بھیجا گیا، مولانا ولایت علیؒ کے موقع پر پہنچنے کا حال ان الفاظ میں درج ہے۔

”الحمد للہ علی احسانہ و کمال منہ و کرمہ کہ بتایخ ہفتدہم شہر شوال روز جمعہ ۱۲۶۷ھ جناب حضرت مولانا... بمظہر کرامات لم یرلی... مرشدنا و امیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ وبرکاتہ و النورہ... مع تمام اہل قافلہ و آلات و اسباب و خیل... مجھ سے از فضل رب الارباب انبیان ہجوم اعداء بجلومت اہل اسلام جلوہ افروز شدند۔“

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی۔ راجہ کو شکست ہوئی اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جا کر پناہ لی، جو اس وقت تک پنجاب کے ایک معقول حصے پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح ذخیل ہو چکے تھے۔ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۹ء) بعد (۱۸۴۹ء) پھر جنگ ہوئی، اور نہ صرف پنجاب، بلکہ سکھوں کا پورا مقبوضہ انگریزی عملداری میں آگیا۔

حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک ان پر براہ راست زور نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکر نہ لی جائے اور انھیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔ مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی

۱۔ صورت حال کے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے :-
(الف) گلاب سنگھ، سکھوں کے ماتحت صرف جموں کا گورنر تھا۔ کشمیر کی گورنری امام الدین سپرد تھی اور بالائی ہزارہ اس زمانہ میں کشمیر کے ماتحت تھا۔

(ب) جب تک سکھ برسرِ اقتدار رہے، مجاہدین کی لڑائیاں ان سے ہوتی رہیں۔
(ج) رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد سکھ حکومت خانہ جنگی کے باعث کمزور ہو گئی، تو خواتین ہزارہ اور مجاہدین نے شمالی ہزارہ کے بڑے حصے پر قبضہ جمالیا۔
(د) نومبر ۱۸۴۵ء میں انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ ہوئی۔ اس میں مجاہدین اور خواتین کو مزید استحکام کا موقع ملا۔

(لا) گلاب سنگھ اس جنگ میں الگ رہا تھا۔ اس لئے جنگی خرچ لے کر جموں نے علاوہ کشمیر بھی اسے دے دیا گیا۔ اس کے بعد مجاہدین کو براہ راست انگریزوں سے سابقہ پڑا۔

شکست ہو، سرکار انگریزی کا بہر حال فائدہ تھا۔

اسی لئے شروع شروع مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی لیکن جب پنجاب کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ تو مجاہدین حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے۔ مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے نبرد آزما ہونا خلاف مصلحت خیال کرتے تھے۔ کوئی فرق ایک دوسرے سے مطمئن نہیں تھا کہ گلاب سنگھ کے سلسلے میں حکومت نے دھمکی دی۔ ابھی گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا کہ جاسوسیوں نے باشندوں کو بھڑکایا۔ اور انھوں نے مجاہدین کے ساتھ شرمناک غداری کی۔ ایک روز مقرر کر کے سارے علاقے میں ان غریب الوطن "ہاجروں" کا قتل عام کر دیا اور سید ضامن شاہ جس کی درخواست پر مولانا عنایت علی کو بھیجا گیا تھا اور جس کی تمام ہائیڈو مجاہدین کی امداد و اعانت سے واپس مل چکی تھی نے بھی بے وفائی کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد مولانا نے صوات بنیر کا رخ کرنا چاہا مگر سرکار انگریزی مزاحمت کر دیا۔

اسلامیہ تذکرہ صادقہ کی روایت ہے (ص ۱۲۲-۱۳۵) مگر اس غداری اور قتل عام کا ثبوت اور کہیں نہیں ملتا۔

مولوی عبد الرحیم صاحب نے تذکرہ صادقہ "میں اس مزاحمت" کی تفصیل میں سرکاری دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کے بعد درہ ڈوب کے مقام پر مجاہدین اور انگریز فوج کے درمیان بھی لڑائی ہوئی جس میں مجاہدین کو شکست ہوئی اور یہ دونوں بھائی گرفتار کر کے حراست میں پٹنہ بھیج دیئے گئے۔ انگریزی فوج کی مکان جیل ایسٹ کے ہاتھ میں بھی (ص ۱۲۲)

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ناچار حکومت کے پیدا کردہ حالات سے مجبور ہو کر اپنے بھائی اور خاص رفیقوں کے ساتھ انھوں نے وطن کی راہ لی۔ پھر بھی ان کے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد میرا ولاد علی (ف ۱۲۵۵ھ) ساکن سورج گڑھا ضلع منگیر کی قیادت میں خفیہ طریقے پر ستھانہ پہنچ گئی۔ واپسی پر دونوں بھائیوں کو پٹنہ کے مجسٹریٹ کے روبرو حاضر ہو کر دو سال کے لئے چالک دینا پڑا۔

مولانا ولایت علی دو سال تک وطن میں رہ کر تبلیغ و تذکیر کرتے رہے مختلف علاقوں میں خاص مبلغ بھیجے۔ اپنے بھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی کو پھر بنگال بھیجا۔ اور تمام مشاغل اس طرح جاری کر دیئے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب مولانا سرحد کا رخ نہیں کریں گے۔ حکومت بھی مطمئن ہو گئی، کہ پورے دو سال قیام کے بعد یک بیک آپ نے چند مخلصوں کے ساتھ خفیہ صدوات بنیر کی راہ لی۔ پورب اور بنگال کے دیہاتوں میں ان کے مبلغ موجود تھے، جو لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے اور جہادین کے مصارف کے لئے مال جمع کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ ان ہی سے اسی سورج گڑھا کو مشہور محدث میاں صاحب سید ندیم حسین صاحب دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ) کے مرزومہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

۱۹۲۱ء میں چالک کی تاریخ ۲۳ جولائی ۱۹۲۱ء سرکاری کاغذات میں ملتی ہے۔ پٹنہ کے مشہور فرم امیر خاں و شہداد خاں کے شریک شہداد خاں اور دلاور خاں کی ذاتی ضمانت تھی جس کی یادداشتیں میں یہ لوگ بھی بعد کو مصیبتوں کا نشانہ بنے اور ان کا فرم تباہ کر دیا گیا (۱۹۲۰ء)۔
ابتداء کا ذکر آگے آتا ہے۔

مختصر تبرعات میں بڑی برکت دیتا۔

وہاں پہنچنے کے بعد غالباً ڈیڑھ سال سے زیادہ عمر نے مساعدا ت نہ کی۔ یہ پوری مدت جہاد کی تیاریوں میں گزری، مگر ابھی قتال و جدال کے سلسلہ شروع نہیں ہونے پایا تھا کہ رحمت الہی نے یاد کیا۔ سرحد کی زمین پسند آئی اور وہیں رہ گئے۔ مولانا ولایت علی کا انتقال سید صاحب کی شہادت کے ۲۲ سال بعد اور سن ۱۲۷۵ھ سے چار پانچ سال پہلے (محرم ۱۲۶۹ھ - اکتوبر ۱۸۵۲ء) میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس مہاجر و مرابط کی تربت پر اپنے انوار رحمت کی بارش فرمائے آمین

مولانا ولایت علی صاحب کے بعد

مولانا عنایت علی غازی ان کے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی مجاہدین کے امیر تسلیم کئے گئے (۱۲۶۹ھ - ۱۸۵۲ء) یوں تو یہ شروع سے آخر تک اپنے بھائی کے ساتھ اور ان کے تمام کاموں میں دست و بازو بنے رہے، مگر ان کا مزاج اور طبیعت کارنگ جدا تھا۔ ان پر تیزی اور شجاعت غالب تھی۔ سید صاحب سے بیعت (۱۲۳۹ھ) کے بعد ایک منٹ کے لئے کبھی کبھی آرام نہیں کیا۔ پہلے اپنے امیر و مرشد حضرت سید شہید کے احکام کے مطابق تبلیغ و جہاد میں مصروف رہے۔ امیر کی شہادت کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کے مشوروں اور

ہدایت کے مطابق اعلیٰ کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔

تسلیم اپنے شیخ کے ساتھ یہ بھی میدان جہاد میں شریک تھے کہ انھیں
مولانا شہید دہلوی کے مشورے سے نواح دہلی کی طرف ان
 غلط فہمیوں کے سد باب کے لئے روانہ کیا گیا، جو بعض مدعیان علم نے
 مجاہدین کے متعلق ان اطراف میں پھیلا رکھی تھیں۔ اسی دوران میں
 بالاکوٹ کا دردناک واقعہ پیش آیا۔ اور آپ وطن لوٹ آئے۔ جب
 مولانا ولایت علیؒ نے دکن سے واپس آکر جماعت کی از سر نو تنظیم شروع کی
 تو آپ کو بنگال کی طرف روانہ کیا، جہاں آپ نے پہلی بار سات برس
 مسلسل نہایت جانفشانی اور بردباری کے ساتھ گاؤں گاؤں کا دورہ
 کیا۔ اور یہ انھیں ”دوروں“ کا اثر تھا کہ بنگال کی سر زمین تیس چالیس برس تک
 مجاہدین سرحد کے لئے آدمی اور روپیہ فراہم کرتی رہی۔

پہلا دورہ سات برس (یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ تک) جاری رہا
 پھر آپ سیدضامن شاہ رئیس کاغان کی مدد کے لئے میدان جہاد پہنچ گئے (۱۸۴۴ء)

۱۰ تذکرہ صادقہ - ۱۳۳۱ھ نیز نیرت سید احمد شہید - طبع دوم ۱۹۱۰-۱۹۱۱ء

ایک صاحب علم اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ مولانا عنایت علیؒ نواح دہلی کی طرف کبھی
 نہیں بھیجا گیا۔ اور ان کا دائرہ عمل ہمیشہ بنگال ہی رہا۔ انیسویں صدی کے دوران میں راقم اسکی مزید تحقیق نہ کر سکا
 ۱۱ صاحب تذکرہ صادقہ نے ”سات برس“ لکھا ہے، مگر یہ نہیں بتاتے کہ ۱۸۳۹ء اور
 ۱۸۴۴ء کے درمیان وہ کس مہم میں مصروف رہے؟

جہاں آپ ایک مدت تک راجہ گلاب سنگھ والی کشمیر سے برسرِ پیکار رہے۔ پھر جب ”بڑے حضرت“ (مولانا ولایت علی صاحب) نے خود پہنچ کر زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی، تو آپ ان کی ماتحتی میں ڈیڑھ برس اور مصروفِ قتال رہے۔ یہ معرکہ آرائیاں بار آور ہو رہی تھیں کہ گلاب سنگھ اور سرکارِ انگریزی کی صلح ہو گئی۔ پھر درہ ڈب (کے مقام پر مجاہدین کو انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور مولانا عنایت علیؒ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ پٹنہ واپسی پر مجبور ہوئے) (۱۸۷۷ء) جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔

مگر اس مردِ غازی کو چین کہاں؟ مولانا عنایت علیؒ کو بجا طور پر ”غازی“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ صاحبؒ سے بیعت کے بعد (۱۲۳۹ھ) اپنے آخری لمحہ حیات (۱۲۷۸ھ) تک انھیں ایک دل بھری اہل دنیا کی طرح آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ بالاکوٹ سے لوٹے، تو پھر ننگال کا رخ کیا۔ اور پھر تین چار سال تک مسلسل اس خطے میں جہاد و احیائے سنت کی تبلیغ کرتے رہے۔ یہ آپ کا دوسرا تبلیغی دورہ تھا۔ اس کے بعد جب تیسری مرتبہ سرحد کو گئے، (۱۸۵۱ء) تو وہیں کے ہو رہے، جس کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

تبلیغی دوروں میں ان کا مستقر صوبہ بنگال کے ضلع

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ہوتا۔ جب سفر کی صعوبتوں سے خستہ ہو جاتے، تو وہیں حاجی مفید الدین صاحب کے گھر پر آرام فرماتے۔ آپ کی دوسری اہلیہ (جنھیں غائبانہ ایجاب و قبول کر کے آپ کے پاس بھیج دیا گیا تھا) وہیں رہتیں مگر یہ وقفہ بھی بے عملی کا نہ ہوتا۔ بلکہ اس اثناء میں حاکم پورا اور اس کے نواح کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں آکر آپ کی صحبت اور موعظا سے فائدہ اٹھاتے۔

فصل خصوصاً آپ کی تبلیغ کے سلسلے میں پنچایت اور فصل خصوصیات کا نظم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ طاغوتی عدالتوں سے

اجتناب کو ٹی نہی چیز نہیں۔ اہل حق ہمیشہ سُنے تَحاکم الی الطاغوت سے بچنے رہے ہیں۔ اور آخر قرآن مجید میں جس چیز کے انکار، اور جس سے کھلم کھلا بیزاری کا حکم دیا گیا ہے، اس سے اہل حق تعاون کس طرح کر سکتے ہیں؟ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ سید شہیدؒ کے متبعین بھی اس پر خاص زور دیتے تھے۔ اچھا ہوگا کہ آپ یہ تذکرہ خود مولانا عبدالحکیم صادق پوری (مولود ۱۲۵۲ھ وفات ۱۳۴۱ھ) مولف تذکرہ عاقدہ کی زبانی سنیں:-

”لوگوں کے اصلاح حال اور فیصلہ طاغوتی سے بچنے کے لئے ضرورت

تھی کہ جہاں لوگوں کو فساد و فتن سے روکا جائے۔ وہاں ان میں عدل و
تصفیح کی روح بھی پھونکی جائے۔ اور ان کے ناگزیر تنازع اور پیچیدہ
مسائل کے محاکمہ اور فیصل کے لئے کوئی صورت قائم کر دی جائے اور
ساتھ ہی ساتھ شاوریہم فی الامر کی سنت بھی ادا ہو سکے۔ چنانچہ جناب
ہر ایک بستی میں جہاں مسجد موجود ہوتی وہاں امام مقرر کرتے (اور جہاں
مسجد نہ ہوتی وہاں مسجد بھی تعمیر کرا دیتے) اور فصل خصوصیات کا بار
اسی کے شانہ پر رکھتے۔ چار پانچ کوس کے حلقے میں کسی بڑی مسجد کو
جامع مسجد قرار دے کر ایک تعلیم یافتہ متدین امام سپرد کر دیتے اور امام مہنزلہ
سشن جج متصور ہوتا۔ اگر اس پر بھی لوگوں کی تسکین خاطر نہ ہوتی
تو متخاصمین کی اپیل پر بذات خود ان مقامات پر پہنچ کر فصل تنازع
فرماتے اور ملفوظات کیمیا اثر سے تالیف قلب فرماتے۔“

مولانا عنایت علی غازیؒ کی صحیح جگہ میدان جنگ تھی۔ اور
جہاد یہیں ان کے حقیقی جوہر کھلتے تھے۔ ان کے جہاد کے چار
دور ہیں۔

(۱) پہلا دور سید صاحبؒ کی معیت میں، جب تک وہ وہاں سے
ایک دوسری مہم پر نہ بھیج دیئے گئے۔

(۲) دوسرا دور مشہد بالا کوٹ کے تقریباً تیرہ برس بعد شروع

ہوتا ہے، جب وہ سید ضامن شاہ کی درخواست پر اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علیؒ کے حکم سے بالا کوٹ گئے (۱۸۶۴ء) یہ جنگ ساڑھے چار برس جاری رہی۔ یوں تو اپنے جارحانہ حملوں سے آپ نے شروع ہی میں ضامن شاہ کے قلعے، کل علاقے اور مورچے واپس دلادئے تھے۔ مگر گلاب سنگھ کے مکرو فریب اور مقامی ہماردوں کی غداروں نے مجاہدین کو تتر بتر کر دیا۔ اور وہ سرکار انگریزی کی شرطوں کے موافق وطن لوٹنے پر مجبور ہوئے۔

مولانا ولایت علیؒ کے پہنچنے سے پہلے، مولانا عنایت علیؒ نے راجہ گلاب سنگھ کو شکستیں دیں، اور سید ضامن شاہ، رئیس کاغان کے جو مقبضات واپس لے لئے ان کے متعلق مولوی عبدالرحیم صاحب کا مختصر اور محتاط بیان یہ ہے۔

”بڑے بڑے معرکے سر کئے اور ظفریاب ہوئے جن سے کفار و منافقین کے دل ہار گئے۔ سکھوں سے متعدد مورچے، قلعے، علاقہ جات چھین لئے، خزانین غدار اور سرکش کو بھی مطیع و فرماں بردار کر لئے۔ تمام امن و طمانیت بخش کر کلمہ توحید کی منادی کر دی اور حدود و قصاص اسلامی جاری کر دیئے۔“

۱۔ صاحب تذکرہ صادقہ کی روایت کے مطابق۔ ۲۔ تذکرہ صادقہ ۱۳ مورچے پر یہ حاشیہ بھی درج ہے۔ ”ملک چچہ و پھلی مع قلعہ جات ڈب، مظفر آباد۔ کل اٹھارہ مورچے“

اس کی تفصیل اس قلمی رسالہ یا "اعلام نامہ" (مورخہ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ) میں مذکور ہے، جو میدانِ جہاد سے ہندوستانی مجاہدین نے اپنے اہل ملت و وطن کے نام ارسال کیا تھا۔

(۳) جب مولانا ولایت علی مستقل طور پر سرحد کو ہجرت کر گئے۔ اور تقریباً ڈیڑھ برس قیام کے بعد وہیں ان کا انتقال ہو گیا (ماہ محرم ۱۲۶۹ھ)۔ یہ زمانہ جہاد کی تیاریوں میں گزرا۔ اور کوئی خاص جنگ نہ ہو سکی۔ مولانا عنایت علی مزاج کے تیز تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کچھ

۱۵ تاریخوں میں بڑا اختلاف ہے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب (ف ۱۳۷۱ھ) نے انڈمان سے واپسی کے بعد تذکرہ صادر لکھی، اور اس حال میں کہ ان پر سرکار کی نظر عنایت قائم تھی۔ پچاروں نے بہت بچ بچ کر لکھا ہے۔ سرکاری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری مرتبہ سرحد پر مولانا ولایت علی صرف ایک سال زندہ رہے (وہابی ٹرائل - ص ۱۵۶، ۱۵۷) تذکرہ صادق میں (ص ۱۲۸) تین چار برس قیام کے بعد وفات کا ذکر آتا ہے بہر حال سنہ وفات میں اختلاف نہیں۔ راونشا کا ایک بیان یہ ہے کہ دوسری مرتبہ ۲۱ مئی ۱۸۵۱ء (رجب ۱۲۶۷ھ) کو ولایت علی سرحد پر پائے گئے (کلکٹر لٹ - ص ۱۶۱) اس طرح پرگو یا ڈیڑھ سال کے بعد وفات ہوئی اور یہی قرین قیاس ہے۔ تذکرہ صادق کی روایت تین چار برس قیام کی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ۱۸۵۱ء میں واپسی اور ۱۸۵۲ء میں وفات متعین ہے پھر تذکرہ صادق میں واپسی کے بعد پٹنہ میں دو برس قیام کی بھی تصریح ہے۔ نیز یہ بھی درج ہے کہ پٹنہ سے دہلی تک کا سفر ڈیڑھ برس میں طے ہوا تھا (ص ۱۲۶) پھر قیام سرحد کی مدت تین چار برس کس طرح ہو سکتی ہے؟ بعض دوسرے ماخذ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۱ء کے لگ بھگ سرحد پر دیکھے گئے (پٹنہ ص ۱۴، حاشیہ)

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ہونا چاہئے۔ جہان نادر خاں والی انب سے اس کی شرارت کے باعث آپ نے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی، مگر مولانا ولایت علیؒ نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج غازیؒ کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ، بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جا رہے، اور ان کی املاک و فوج کی نہایت خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ نگہداشت کی۔

(۴) مولانا ولایت علیؒ کے انتقال کے بعد آپ منگل تھانہ سے ستھانہ (مجاہدین کا بڑا مستقر) واپس آئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی (۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۲ء) اس وقت جنگ کے دو محاذ تھے۔ ایک ستھانہ اور دوسرا نارنجی اور منگل تھانہ۔ مولانا عنایت علیؒ پہلے نارنجی میں کھڑے، پھر منگل تھانہ میں۔ وہاں مجاہدین کو شکست ہوئی، تو آپ نے ستھانہ کا قصد کیا، لیکن راستہ ہی میں پیام اجل آپہنچا۔ اس آخری دور میں جو لڑائیاں ہوئیں، یا جن مصائب کا آپ کو سامنا کرنا پڑا، ان کی تفصیل آگے آتی ہے۔

یہاں صاحب تذکرہ صادقہ کے ایک بیان کی توضیح بلکہ تردید مقصود ہے۔ مولانا عبدالرحیم نے سید اکبر شاہ (امیر صدقات) اور ان کی اولاد (سید مبارک، سید عمر، سید عمران، سید مدار) پر بے وفائی کا الزام عاید کیا ہے، جو واقعات سے صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ عجیب تر بات یہ ہے

کہ ان میں صرف سید مبارک شاہ - سید اکبر شاہ کے بیٹے تھے - اور سید عمر وغیرہ ان کے بھائی تھے - ان کے بھائی اور بیٹے سید مبارک شاہ، سب کے سب آخر دم تک مجاہدین کے معاون و مددگار رہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانیاں برداشت کیں -

اس وقت خود سید اکبر شاہ زندہ تھے - ان کی وفات ۱۸۵۷ء عین ہنگامہ کے دوران میں ہوئی - ان کی موجودگی میں، ان کے بیٹے اور بھائیوں کے اختیارات ہی کیا تھے؟ جو وہ بے وفائی یا غداری کی جرأت کرتے -

مجاہدین کے ابتداء و مصائب کی تفصیل سے پیشتر **غداروں پر اعتماد** یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل سرحد

اور خوانین کی غداری اور بے وفائی کے باعث ان مجاہدان راہ حق کو بار بار سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا - خود حضرت سید شہید گوہر دارا ان پشاور کی غداری نے جس قدر اذیت پہنچائی، وہ سب کو معلوم ہے - مگر یہ غداری اور خیانت ختم نہیں ہوئی، اور حیرت یہ ہے کہ یہ مجاہدین بھی برابر

سے ہنسنے لکھا ہے کہ ان دنوں (۱۸۵۷ء) وہ ستھانہ کے مجاہدین کا لیڈر ہے - ص ۱۱

۱۸۵۷ء انڈین مسلمانز - ص ۱۱؛ ایک صاحب علم نے صحیح تاریخ وفات ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء بتائی ہے

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ سادات ستھانہ کی قربانیاں مجاہدین صادق پور سے کسی حال میں کم نہ

تھیں - واللہ اعلم بالصواب -

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ان غداروں پر اعتماد کرتے رہے۔ حالانکہ مومن کی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ ایک سو راخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مینا بتانی مجاہدین سید صاحبؒ کی غیبوبت اور دوبارہ ظہور کے توقع پر ان غداروں کو برداشت کرتے رہے، یہ سب سے بڑی غلطی تھی۔ ان مجاہدینؒ نے اس سلسلے میں روارکھی۔ بہر حال ہم اس پر آگے چل کر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ سر دست خوائین کی غداری کے متعلق ایک باخبر اور مبتلائے المیہ ہستی کے تاثرات نذر ناظرین ہیں۔

”اُس زمانے میں پنجاب و نواح پنجاب متعدد خوائین کے زیر حکومت تھا۔ گویا ہر ایک تعلقدار آزاد بادشاہ تھا۔ یہ آپس میں تیغ آزمائی کرتے۔ حرکاتِ شنیعہ کا بے غیرتی کے ساتھ ارتکاب کرتے۔ اخلاق و حمیت سے عریاں تھے۔ غداری، خود غرضی اور نفاق ان کا طرہ امتیاز تھا۔ خلاوت ایمانی سے آشنا تک نہ تھے۔ اس حالت زبوں سے سکھیں کو انھیں ستانے کی جرأت ہوتی۔ اور ان کے آپس میں خوب بھینڈے لڑا دیتے۔ جب وہ اپنی قوت آزمائی سے عاجز آجاتے، تو حالتِ اضطراب میں برکات مجاہدین یاد آجاتیں اور نہایت لجاجت کے ساتھ ایک بے لڑا کی طرح اعانت و نصرت کی درخواست کرتے اور پھر اثناءِ معرکہ میں یا خیر انجام پر دشمنوں کے ساتھ پنجاب کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں۔ یہاں کبھی کبھی قبائلی حکومت نہیں تھی۔ البتہ سردار علاقے میں بعض خوائین کا اقتدار تھا۔

یہ تاثرات ہیں، مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوریؒ ابن مولانا فرحت حسین صاحب (ف ۱۳۷۷ھ) کے جو اپنے دونوں چچا مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ کی سرگرمیوں میں کمسنی ہی سے شریک تھے۔

چھپر چھار ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۷ء
یہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ مولانا
عنایت علیؒ کی جہادی سرگرمیوں کا

چوتھا دور مولانا ولایت علیؒ کے انتقال کے بعد شروع ہوتا ہے (محرم ۱۲۶۹ھ تا ۱۲۷۹ھ) یہ بھی پہلے گزر چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے حلیف والی انب پر حملہ کرنا چاہتے تھے، مگر مولانا ولایت علیؒ نے اجازت نہ دی۔ جب زمام قیادت ان کے ہاتھ میں آئی، تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ جہاں داد خواں، والی انب سے ٹکر ناگزیر ہو گئی۔

۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان مجاہدین اور سرکار برطانیہ کے درمیان جو کشمکش جاری رہی، اس کا مختصر بیان درج ذیل ہے۔
”۱۸۵۲ء میں ان کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ستھانہ کیمپ میں برطانی

۱۳۶-۱۳۵

۱۸۵۲ء مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری (ف ۱۳۷۱ھ) کے متعلق والد ماجد مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب منڈلہ (مولود ۱۲۹۹ھ) ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ ان کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

علاقے سے آدمی اور رُپے کی آمد برابر جاری تھی۔ اور ہماری فوج سے ان کی باغیانہ خط و کتابت بھی پکڑی گئی تھی۔ ان مجاہدین نے بڑی چالاکی سے یہ چاہا تھا کہ ہماری چوٹھی دہسی سپاہ، متعینہ راولپنڈی کی وفاداری داغدار ہو جائے۔“

”برطانی حاکمیت اب زیادہ دیر تک حقائق سے آنکھ نہیں بند کر سکتی تھی۔ ۱۸۵۲ء کے موسم بہار ہی میں ”ایک سرحدی جنگ“ کی تجویز زیر غور آچکی تھی۔ اسی سال ان لوگوں نے ہمارے حلیف، ریاست انب کے سردار پر حملہ کیا، جس سے برطانی حاکمیت ایک فوج بھیجنے پر مجبور ہوئی۔“

”۱۸۵۲ء میں ہماری فوج کے متعدد افراد ”باغیوں“ سے خط و کتابت کے الزام میں ماخوذ اور سزایاب ہوئے۔“

”میں یہاں ان زیادتیوں، توہین اور قتل کے واقعات کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا، جو ۱۸۵۶ء و ۱۸۵۷ء کی جنگ سرحد کا باعث ہوئیں۔ اس پوری مدت میں (۱۸۵۶-۱۸۵۷ء) مجاہدین نے سرحدی قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار رکھنے کی کوشش کی۔“

۱۷ راولپنڈی نے ان میں سے ایک کا نام محمد ولی ریجمینٹ منشی بتایا ہے۔

۱۵-۱۶ دئی انڈین مسلمانز۔

اس واقعے کے متعلق مجاہدین کے سب سے بڑے کرم فرما اور منتظر صاحب کے
پیر و مرشد جناب راونشا (Revenshaw) کالکٹر پٹنہ (۱۸۶۵ء) نے
اپنے مشہور مہمورنڈم میں تحریر فرماتے ہیں:-

۱۸۵۲ء کے رکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مذہبی دیوالوں نے
ہمارے حلیف جہاں داد خاں، والی انپ پر حملہ کیا جس کے باعث آگے
چل کر ۱۸۵۸ء میں ضروری ہو گیا کہ سرسٹنی کاشن کی سرکردگی میں ان کے
خلاف ایک مہم بھی جائے۔

اس سلسلے میں منتظر صاحب کی مزید توضیح ملاحظہ ہو:-

”ایک معمولی واقعے سے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہوگا۔

۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء کے درمیان ہمیں مختلف وقتوں میں سولہ مہم

(Expeditions) جاری کرنا پڑی، جن میں ۳۳۰۰۰ ہزار تربیت

یافتہ فوج سے کام لیا گیا۔ اس دوران میں ستھانہ کی نو آبادی

گو سرحد کے طول و عرض میں جہاد کی روح بھڑکاتی رہی، پھر بھی ہماری

فوج سے راست ٹکرنے لے کر انھوں نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔“

آخری ابتلاء | غالباً اوپر کے بیانات سے یہ اندازہ ہوا ہو گا کہ مجاہدین کے
۱۸۵۰-۱۸۵۸ء ہم خیال و ہم مشرب اصحاب بہار و بنگال میں خفیہ

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

طور پر چننے کے سرحد بکھتے تھے اور بیرون ہند کی امارت کی تائید کے لئے اندرون ہند میں بھی ان کا خاص نظام تھا (جس کی ضروری تفصیل آگے آئے گی) یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور سارا کام "حسن و خوبی کے ساتھ چلتا رہا کہ اسی دوران میں ۱۷۵۷ء کا پُر آشوب حادثہ پیش آیا اور گوجا ہدین اور ان کے معاونین

سید ایک صاحب علم نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ بیان اس عمیبت کے ساتھ صحیح نہیں اس لئے کہ

راولپنڈی، نوشہرہ اور مردان کی فوجوں میں بغاوت کی تحریک ہوئی۔ اور

مردان والی فوج کے کچے کچے آدمی مولانا عنایت علی کے ساتھ ہو کر زارنجی اور گل تھانہ میں لڑے۔

ہماری عرض یہ ہے کہ مجاہدین جماعتی حیثیت سے ۱۷۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ ہے ۱۷۵۷ء کے ہنگامے

ایک قومی جنگ سے زیادہ حیثیت نہیں دیا جاسکتی۔ اسی لئے سید صاحب کے ماننے والے ایک دینی نظام

والبتہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔ نوشہرہ اور مردان کے ایک آدھ دستوں میں مجاہدین کی سرگرمیوں

کو شرکت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ۱۷۵۷ء سے پہلے بھی فوجوں میں کام کرتے تھے، جیسا کہ ابھی اوپر

نظر کیے جانے اس قسم کی ایک کوشش کا ذکر آچکا ہے، جو مجاہدین نے ۱۷۵۷ء میں راولپنڈی کے کسی

دیہیہ کے اندر کی تھی۔ وہ بانی ٹرائل ۱۷۵۷ء میں بھی عبداللہ قادی نے یہ شہادت دی ہے کہ راولپنڈی کی

فوجوں سے مجاہدین کا ربط قائم تھا (ص ۱۷۷)

اسٹارڈ (Stoddard) امریکی اور بعضے دوسرے یورپی مورخ خیال کرتے ہیں کہ ۱۷۵۷ء کی

ہندستان کی قومی لڑائی کبھی وہابیوں کی دعوت کا نتیجہ تھی، (حاضر العالم الاسلامی ج ۱ ص ۲۶۳) لیکن یہ

خیال صحیح نہیں۔ سید صاحب کے متبعین اس قومی جنگ سے بالکل الگ رہے۔ ان کا اپنا الگ نظام

تھا۔ اور وہ اس کے تابع تھے۔ ۱۷۵۷ء کی قومی جنگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست کی

پیداوار تھی۔ سر جان لارنس نے بہت صحیح کہا ہے کہ اس بغاوت کی پیدائش فوج ہی سے ہوئی

کسی دوسری سازش کا اس میں مطلق دخل نہیں تھا (ص ۵۸۲)

ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے، پھر بھی ایٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر (W. Taylor) نے مولانا احمد اللہ

صادق پوری (متہم مقدمہ سازش ایٹنہ ۱۸۶۵ء، ف درانڈمان ۲۸ فروری ۱۸۶۵ء)

۱۲۹۸ھ) وغیرہ کو بہت ادق کیا (۱۸۵۷ء) اور اسی افراتفری اور

ہڑبونگ میں سرحد سے مواصلات کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا۔ جس کی وجہ

سے مجاہدین سرحد ایسی آزمائش سے دوچار ہوئے کہ الامان والحفیظ۔ مولانا

عبدالرحیم صادق پوری (جو مجاہدین کے لئے رپے اور سامان فراہم

کرنے والوں کے سرگرم شریک اور معاون تھے) لکھتے ہیں:-

۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پر خطر تھی۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار

تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھا اور

کیوں کر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لئے کوئی سامان کیا جاسکتا؟

مسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔ درختوں کی کوپلوں اور پتیوں پر

اصحاب صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک

نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں۔ آپ کے پاس جو کچھ نقد تھے۔

آپ ہاجرین و انصار پر صرف کر چکے۔ اور وہ تھا ہی کیا؟ اونٹ کے منہ

میں زیرہ۔ اب اُدھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے۔ زندگی

مولانا عبید اللہ سندھی اس قبلاؤ اور طعن و بدگمانی کو بھی عقیدہ غلبہ کا شاخسہ بتاتے ہیں۔ یہ حدود بخاریاتی

اور ان بلاکشان راہ حق پر ناروا اتمام ہے۔ ملاحظہ ہو مولانا سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر ۸۵-۸۶

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگلی اہم مضطر ہو کر متی نصر اللہ پکار اٹھی تھی۔“

یہی لیل و نہار تھے کہ سرکار انگریزی نے ۱۸۵۸ء میں پشاور سے

جنرل کاٹن (Cotton) کی سرکردگی میں چھ ہزار فوج کے ساتھ مجاہدین پر

حملہ کر دیا۔ مرے کے بارے میں شاہ مدار، شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔

مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد مردانہ وارداد شجاعت دے کر شہید ہوئی۔

کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے۔ مولانا غنایت علی نے ستھانہ کا قصد کیا، مگر

راستہ ہی میں جنبٹی کے مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

صاحب تذکرہ صادقہ وفات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں (ص ۱۳۸)۔

”مگر اس صبر و استقامت کے کوہ نے نہایت علم و رضامندی کے

ساتھ اَللّٰہُمَّ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی سے زبان تر کرتے ہوئے بعینہ بخار

وَضِیْقِ النَّفْسِ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۸ء کے آخر میں بحین المؤمن سے

جنت نعیم کو رحلت کی۔“

”اَللّٰہُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَاَرْحَمْہٗ وَاَحْشِرْہٗ فِی زَمْرَةِ الْمَہَاجِرِیْنَ

الذین ہاجروا وواجہدوا مع نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم“

”مولانا ولایت علی (د ۱۳۵۹ھ) اور مولانا غنایت علی (د ۱۲۷۴ھ) کے بیچوں

مختلف امراء ہند کی سرگرمیوں میں مولانا ولایت علی کے بڑے صاحبزادے

۱۳۸۸ء تذکرہ صادقہ ص ۱۳۸

۲۷ وہابی ٹرائل۔ منہ شہادت حسینی، ماخوذہ مقدمہ انبالہ

Wahabi Trial

مولانا عبد اللہ صادق پوری (مولود ۱۲۷۵ھ) کا نام زیادہ نمایاں طور پر آتا ہے یہ کسی ہی سے اپنے والد ماجد کے ساتھ جہاد و قتال میں مصروف رہے۔ لیکن ان بزرگوں کے علاوہ بہتیرے اور بھی ہندوستانی مہاجر تھے جنہوں نے سرحدی علاقے میں جہاد کا علم بلند رکھنے کی کوشش کی۔ واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا تقاضا ہے کہ مولانا عبد اللہ کے دور کے حوادث کی تفصیل سے پہلے ان سالکانِ راہِ نبوت کا بھی مختصر ذکر کر دیا جائے۔

افسوس کہ ۱۵۸۰ء کے ابتلاء کے متعلق مولوی عبد الرحیم صاحب نے کوئی قابل ذکریات نہیں بیان کی اور جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی اس قدر منتشر اور غیر مربوط کہ اصل فہم "اور معرکہ" کے متعلق معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

انگریز لکھنے والوں میں ایچ، ڈبلیو، بیلو (H.W. Bellaw)

نے اس طرف اشارہ کیا ہے:-

مبارک شاہ (ولد سید اکبر شاہ، رئیس صوات) نے عنایت علی کے ساتھ مردان کے قلعے پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کیا، لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ تب عنایت علی، نارنجی چلا آیا اور یوسف زئی قبائل کو درغلانے کی کوشش کی۔ اس حرکت کی پاداش میں نارنجی والوں کی سرکوبی کے لئے پشاور سے جنرل کاشن کی سرکردگی میں ایک انگریزی فوج بھیجی گئی، اور عنایت

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اور اس کی پارٹی کو ہاڑیوں میں بھگا دیا گیا۔“

ہنٹر نے خلافت معمول ۵۸ء کی مہم کا بالکل سرسری تذکرہ کیا ہے۔
 ”لیکن ۵۹ء میں انھوں نے کھلم کھلا ہمارے خلافت محاذ بنانے کی
 کوشش کی [خاص کر یوسف زئی اور پنجتار قبائل کے ساتھ] اور ان کی جرات
 اس حد تک بڑھ گئی کہ اپنی مقررہ رقم [غالباً زکوٰۃ یا عشر] کے وصول کرنے
 (Collecting their Black Mail) کے لئے انھوں نے

برطانوی حکام سے مدد طلب کی۔ اور ہمارے انکار پر انتہائی دیدہ دلیری سے
 انھوں نے لکٹننٹ ہورن Horne اسٹینٹ کمشنر کے کیمپ پر
 شبخون مارا، جو مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ اب انتقامی کارروائی میں
 تاخیر جائز نہیں تھی، اور سرسڈنی کاشن (Sidney Cotton) پانچزار
 کی ایک فوج لے کر ہاڑیوں میں داخل ہوا۔

یہ ان متعدد لڑائیوں میں سے ایک کا ذکر تھا، جو جنوبی کیمپ
 Ferozic Camp نے سرحد میں برپا کی۔ میں اس کا سرسری ذکر کر کے
 گزر جانا چاہتا ہوں۔ — خاصہ یہ کہ کچھ مشکل کے بعد ہماری سپاہ نے
 باغیوں کے حلیقوں کی بستیوں میں آگ لگا دی، دو اہم قلعے اڑا دیئے
 اور باغیوں کی ستمناہ والی چھاؤنی یکسر تباہ کر دی۔“

مشہد بالا کوٹ (۱۲۶۶ھ) سے لے کر مولانا ولایت علیؒ کے سرحد پہنچنے تک (۱۲۶۶ھ) جو باعزم اور دھن کے پکے مجاہد سرحد میں جہاد کا علم بلند کئے رہے، ان کی مفصل سرگزشت مرتب طور پر نہیں ملتی۔ اسی لئے مختلف امراء کی ترتیب اور ان کے زمانہ امارت کی تعیین ذرا دشوار ہے۔ ایک صاحب علم نے ان امراء کی ترتیب اس طرح بتائی ہے۔

شیخ ولی محمد پھلتی، مولوی نصیر الدین دہلوی، حاجی سید عبدالرحیم سورتی، مولانا عنایت علیؒ، پھر ان کے بعد مولانا ولایت علیؒ۔

جیمس اوکنلے (James O'kinley) جولاء ۱۸۶۸ء کے مقدمہ سازش میں سرکار کی طرف سے پیروکار تھا اور راولنشا اور رتنپری کی بہ نسبت جماعت کے افکار و عقائد سے گہری واقفیت رکھتا ہے، (گو اس کے بیانات بھی فاش غلطیوں سے خالی نہیں) اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہے:-

”جس وقت سید صاحب کو بالا کوٹ میں شکست ہوئی۔ مولوی قاسم ایک مہم کے سلسلے میں مظفر آباد گئے ہوئے تھے۔ شہادت سے یہ مہم ختم ہو گئی۔ اور جو سپاہی جنگ سے بھاگ گئے تھے، مولوی قاسم نے انھیں جمع کیا۔ اور انھیں لے کر یہ ستھانہ روانہ ہوئے۔ انھیں کے ساتھ سید صاحب کے اہل خاندان بھی تھے۔ یہ گاؤں سید صاحب کے مخلص دست

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

سید اکبر شاہ کی ملکیت تھا۔ مولویوں کی شوریٰ میں فیصلہ ہوا کہ مجاہدین تختہ بند
(بنسیر) میں قیام کریں۔ اس گاؤں میں سید اکبر شاہ کا خاندان بہت با اثر تھا۔
”سید صاحب“ کی شہادت کے بعد ایک لیڈر کا انتخاب ضروری تھا۔
ہندوستانی خلفاء کے ذمہ یہ کام ہوا۔ یہ لوگ دہلی میں جمع ہوئے۔ اور
مولوی نصیر الدین کو امیر منتخب کیا۔ اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ یہ ٹونک اور
سندھ پر کڑی نگرانی جائیں۔ اور مجاہدین کے ساتھ شریک ہوں۔

”نصیر الدین دہلی سے چند ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوئے ٹونک میں مزید رنگرہٹ
اور رپے اور اسلحہ سے مدد کی گئی۔ وہاں سے یہ شکار لوہود (سندھ) روانہ
ہوئے، جہاں انھوں نے کچھ دنوں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ سکھوں سے مقابلہ
کے لئے کچھ طاقت فراہم کر لیں۔ ۱۸۳۳ء میں سید صاحب کے اہل خاندان
اور فوج کے باقی لوگ آکر ملے، جو تختہ بند کو بھاگ گئے تھے۔ مجاہدین اصل

سے ایک صاحب علم تختہ بند کی مراجعت کا واقعہ صحیح نہیں سمجھتے۔ راقم قطعی طور پر اوگنلے کے
بیان کی تردید یا توثیق سے قاصر ہے۔

نصیر الدین دو تھے۔ ایک نصیر الدین منگلوری، جو سید صاحب کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ واقعہ
بالاکوٹ کے وقت بھوکر سنگ میں مقیم تھے، پھر شیخ ولی محمد بھٹی کی امارت میں امیر شکر رہے اور ٹوپی میں شہید ہوئے۔
دوسرے نصیر الدین، شاہ محمد اسحاق کے داماد تھے۔ جو ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ میں دہلی سے
چند رفیق لے کر نکلے۔ سندھ اور بلوچستان میں مقیم رہے، پھر تھانہ پہنچ گئے اور امیر بنے، وہیں وفات
پائی۔ غالباً اوگنلے ان ہی مولوی نصیر الدین دہلوی کا ذکر کرتا ہے۔

فوج کے ساتھ سندھ میں رہے، البتہ سید صاحب کا کنبہ لونگ واپس آگیا۔
 ”معلوم یہ ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ اور سکھوں کے خطرے کے باعث امراتہ
 سندھ نے انھیں روک رکھا تھا۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، نصیر الدین شکارپوری
 رہ گئے اور پہاڑیوں میں رہ کر جہاد کا ارادہ ترک کر دیا۔ رفتہ رفتہ آدمی
 بڑھے۔ ہندستان سے سرمایہ اور رنکروٹ آنے لگے، لیکن مولوی نصیر الدین نے
 جنبش نہ کی، اور ہزارہ پر ایک معمولی حملہ کے سوا انھوں نے سکھوں سے کوئی
 جنگ نہ کی۔ لیکن آخر وقت آگیا۔ لارڈ اک لینڈ نے شاہ شجاع کو زبردستی کابل کا
 بادشاہ بنانا چاہا۔ تب دوست محمد نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان
 کر دیا اور وہابیوں سے شرکت کی درخواست کی۔ نصیر الدین مدد دینے پر
 مائل تھے، مگر دوسرے مولوی تیار نہیں تھے اور لوٹ آئے۔ کوئی ایک ہزار
 آدمی لے کر یہ کابل کی طرف بڑھے اور دادر کے قریب خیمہ زن ہو کر تین
 سو منتخب آدمیوں کو امیر کی امداد کے لئے بھیجا۔ یہ غزنی کی حفاظت پر
 متعین کئے گئے۔ اور جب انگریزی فوج نے قلعہ پر حملہ کیا اور قبضہ آوے
 ہو گئی، تو یہ لوگ بالکل تباہ ہو گئے۔ کابل پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اور بدول
 وہابی تتر بتر ہو گئے اور ہندستان و بنگال کو لوٹ آئے۔“

۱۔ اکتلے کا یہ قیاس بالکل غلط ہے۔

۲۔ اکتلے کا مقالہ The Wahabis in India مندرجہ کلکتہ ویلیو

۱۸۷۰ء

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

غزنی کی اس مہم میں مجاہدین کی شرکت کا ذکر منہ پڑنے بھی کیا ہے :-
 ”گو ان کا حملہ زیادہ تر سکھ آبادیوں پر ہوتا تھا، لیکن وہ ”بے دین“ انگریزوں
 کسی حملے کے موقع کو بہت غنیمت خیال کرتے تھے۔ جنگ کابل میں ہمارے
 دشمن کی مدد کے لئے انھوں نے ایک مضبوط فوج بھیجی اور ان کے ایک ہزار
 آدمی ہمارے مقابلہ میں آخر دم تک ڈٹے رہے۔ صرف غزنی کی فتح میں
 تین سو نفوس نے برطانوی سنگینوں سے جام شہادت نوش کرنے کی سعادت
 حاصل کی“

سقوط غزنی کے بعد مولوی نصیر الدین سرحد پار پہنچ گئے، لیکن اوکنلے
 اس باب میں خاموش ہے۔ وہ صرف مولوی قاسم کی واپسی کا ذکر کرتا ہے
 اور ساتھ ساتھ وہ تمام داستان بھی سناتا ہے، جو عقیدہ غلبہ کے عام کرنے
 کے سلسلے میں مولوی قاسم کی طرف منسوب ہیں۔ منہ پڑنے بھی اس کا ذکر کیا
 ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مولوی قاسم سے یہ کمزوری رونما ہوئی ہو۔ بہر حال
 سر دست ہمیں اس سے بحث نہیں۔

ذکر یہ تھا کہ مولوی نصیر الدین دہلوی سرحد پار پہنچ گئے، اور یہ اور ان کے
 ساتھی (جن کی تعداد تین سو کے قریب ہوگی) ستھانہ رہ پڑے۔ یہ
 لوگ کئی سال وہیں پڑے رہے اور غالباً ہندستان سے امدادی رقمیں آنا
 شروع ہو گئی تھیں اور مولانا ولایت علی امیر جماعت سے ان کا ربط قائم

ہو گیا تھا۔

ایک انگریز مصنف کے بیان کے مطابق یہ لوگ مولوی نصیر الدین کی قیادت میں تین برس تک خاموش رہے کہ مجاہدین کے ایک قافلہ کو مستارہ (Munarah) نامی گاؤں والوں نے لوٹ لیا، تو یہ لوگ حرکت میں آئے اور اس گاؤں پر ناگہانی تاخت کی اور کافی مال و اسباب چھین لائے۔ جانیں بھی تلف ہوئیں۔ اس سے یوسف زئی والے (جو مجاہدین کے ہمدرد تھے) دشمن ہو گئے اور ان غریبوں پر حملہ کر دیا۔ بیچاروں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی تعداد صرف ستر اسی کے لگ بھگ رہ گئی مولوی نصیر الدین شہید ہوئے۔

اس واقعے کے بعد مجاہدین وہاں کی مختلف بستیوں سے سمت کر پھرتے تھے۔

A General Report on Yusufzais

۱۷

مولوی نصیر الدین کی شہادت اور اس واقعے کا ذکر اب تک اور کسی سرکاری یا غیر سرکاری کتاب یا رپورٹ میں نظر سے نہیں گزرا۔ عقائد کی کارروائیوں اور دوسرے کاغذات میں مولوی نصیر الدین کا ذکر آتا ہے، مگر پھر وہ درمیان سے حذف ہو جاتے ہیں۔ اور میرا دلاد علی سرگروہ مجاہدین کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو۔ کتاب ۱۸۶۴ء میں چھپی ہے۔ اور مصنف فوج میں ڈاکٹر تھا۔

شہادت کی صحیح تائید بھی نہ معلوم ہو سکی۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ ان کی شہادت ۱۸۶۴ء سے پہلے واقع ہو چکی تھی۔ ایک صاحب علم کی روایت ہے کہ ۱۸۶۴ء میں دریائے سندھ کی طغیانی ستھانہ کے ساتھ مولوی نصیر الدین صاحب کی قبر بھی بہا لے گئی۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

میرا ولاد علی سورج گڑھی مونگیری کی قیادت میں مجتمع ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب سید ضامن شاہ رئیس کاغان راجہ گلاب سنگھ والی کشمیر سے برسرِ پیکار تھا اور اس کی درخواست پر مولانا عنایت علی صاحب غازی اور میر مقصود علی ایک جماعت کے ساتھ بہار سے تشریف لائے۔ یہ تازہ وارد جماعت تین سو افراد پر مشتمل ہو گئی۔ یہ لوگ پانچ پانچ اور تپہ چھ کی مختلف ٹولیوں میں پھیلی (ضلع ہزارہ) تک پہنچے، جہاں میرا ولاد علی کی مختصر جماعت بھی ستھانہ سے آکر مل گئی۔ اور مولوی عنایت علی صاحب کی سرکردگی میں جدوجہد ہوتی رہی۔ مولانا ولایت علی جب موقع جہاد پر پہنچ گئے، تو پھر امیر الجہاد کی ذمہ داریاں بھی انھیں نے سنبھال لیں۔ (۱۲۶۲ھ) اس کے بعد گلاب سنگھ نے انگریزوں سے صلح کر لی، مجاہدین کا قتل عام ہوا۔ اور ان کی پوری فوج انگریزوں کی حراست میں آگئی۔ روہیلے پر خاست کر دیئے گئے مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی حراست میں پٹنہ بھیج دیئے گئے۔ لیکن مجاہدین کا ایک جتھا میرا ولاد علی کی قیادت میں پھر ستھانہ پہنچ گیا۔ یہ جتھا ستھانہ میں کچھ عرصہ تک خاموش رہا، تا آنکہ مولانا ولایت علی دوبارہ سرحد پہنچ گئے۔ اور میرا ولاد علی نے پھر قیادت ان کے سپرد کر دی۔ یہ میرا ولاد علی کی قیادت کا آخری دور تھا۔ جو تقریباً تین چار سال رہا۔ اس کے بعد مولانا ولایت علی اور ان کی وفات (۱۲۶۹ھ) کے بعد ۱۲۷۵ھ تک مولانا عنایت علی امیر الجہاد رہے۔ غالباً میرا ولاد علی کا اسی

دوران میں انتقال ہو گیا (تقریباً ۱۲۵۵ھ) جیسا کہ مقدمہ سازش، پٹنہ ۱۸۷۷ء کے بعض گواہوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔

مولانا غایت علیؒ (ف ۱۲۵۸ھ) کے بعد مولوی نور اللہ امیر ہوئے ان کے دور میں ایک آدھ جھڑپ ہوئی۔ شاہ نور گڑھی میں مقابلہ ہوا (۱۸۵۸ء) مجاہدین کے کماندار اکرام اللہ اور ان کی کافی تعداد شہید ہوئی اور انگریزی فوج نے مجاہدین کی تمام نوآبادیاں تباہ کر دیں۔ ستھانہ اور متگل تھانہ کی نوآبادیاں اس طرح تباہ ہو گئیں، تو مولوی نور اللہ اور ان کے ساتھیوں نے ستھانہ سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ملکائیں اپنی نوآبادی قائم کی۔ اسی دوران میں مولوی نور اللہ کا انتقال ہو گیا

۱۔ وہابی ٹرائل - ص ۱۰

یہ ایک پہاڑی کا نام ہے، جو ستھانہ کے عین اوپر واقع ہے۔ یہ چھ سات ہزار فٹ بلند ہوگی۔ جب ستھانہ پر حملہ ہوا، تو مجاہدین اس پر چڑھ گئے تھے۔ غالباً ”لڑی“ ٹیلے کو کہتے ہیں۔ صحیح لفظ شاید شاہ نور لڑی ہو۔

۲۵ ملک اسادات ستھانہ کی ملکیت تھا، جہاں وہ ستھانہ کی بربادی کے بعد چلے گئے تھے۔ یہ ستھانہ سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ کچھ کچھ مجاہدین بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ مولانا عبد اللہ وہیں امیر بنے تھے۔ جنگ ابیلا کے بعد اسے بھی پر باد کر دیا گیا، جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد اسادات منتشر ہو گئے اور مجاہدین جگہ جگہ اٹھتے بیٹھتے رہے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اور میر مقصود علی، جو وطن گئے ہوئے تھے، واپس آ گئے (۱۸۶۶ء) اور

انہوں نے امیر الجہاد کی حیثیت سے از سر نو مجاہدین کی تنظیم کی۔ تقریباً
ڈیڑھ سال کی امارت کے بعد میر مقصود علی کا بھی انتقال ہو گیا (۱۸۶۸ء)

ان کے بعد مولانا ولایت علی صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) کے بڑے صاحبزادے

مولانا عبد اللہ صادق پوری (مولود ۱۲۶۷ھ) جو اس وقت تک گھربا چھڑ کر برصغیر پہنچ چکے تھے، منتخب ہوئے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا ولایت علی فاجہ

مولانا عبد اللہ صادق پوری

بالاکوٹ سے چند سال پیشتر اپنے امیر و

شیخ کے حکم سے تبلیغ و ارشاد کے لئے دکن

۱۲۷۸ھ ۱۳۰۲ھ
۶۱۸ ۶۲۰

تشریف لے گئے تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے حیدر آباد میں ایک

شریف خاتون سے شادی کر لی تھی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا عبد اللہ

وہیں پیدا ہوئے (۱۲۷۶ھ) ابتدائے طفولیت ہی سے یہ سفر و حضر میں اپنے

امیر مقصود علی دانا پور (پڑنے) کے رہنے والے تھے۔ اور خاندان صادق پور سے ان کی قرابت بھی تھی

۱۸۷۱ء کے مقدمہ سازش (پٹنہ) میں ان کے سگے بھائی الہی بخش کی شہادت سرکاری

گواہ کی حیثیت سے درج ہے (دہائی ٹرائل ۳۷-۳۲) اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے کئی برس پہلے مولانا ولایت علی کے اہل و عیال کو لے کر

وطن واپس آئے تھے۔ اور دو تین سال مشرقی ہند میں مصروف تبلیغ رہ کر ہنگامہ

۵۷ء کے کچھ عرصہ بعد پھر لا پتہ ہو گئے۔ مختلف بیانات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ

۱۲۷۶ھ تک مستقر پر پہنچ گئے تھے۔ ڈیڑھ دو سال کی امارت کے بعد ان کا انتقال

ہو گیا (۱۸۶۲ء) اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ایک مرتبہ میرٹھ

میں گرفتار بھی ہو گئے تھے (ص ۳۲)

والد ماجد کے ساتھ رہے۔ ابھی پندرہ سولہ برس کی عمر ہو گئی کہ والد ماجد کے ساتھ بکھلی اور بالاکوٹ میں جہاد و قتال میں عملی شرکت کی (۱۲۶۲ھ - ۱۲۶۴ھ) پھر دوبارہ اپنے والد کے ساتھ صوات گئے اور وہاں چار پانچ برس قیام ہوا

اس دوران میں فوجی نظم و بندوبست انھیں کے سپرد تھا۔ مولانا عنایت علی کے دور امارت میں (۱۲۶۹ھ - ۱۲۷۴ھ) بھی دو تین سال وہاں رہے۔ پھر چچا کی تیز مزاجی کے باعث ان سے موافقت نہ ہوئی۔

تو اپنے چھوٹے چچا مولانا فرحت حسین صاحب (ف ۱۲۷۴ھ) کی طلب پر پٹنہ واپس آ گئے، لیکن گھر میں اس مرد مجاہد کو قرار نہ آ سکا اور چار پانچ سال کے بعد اپنی تمام جائداد فروخت کر کے اپنے بھائی مولوی عبدالکریم (جو اس وقت نابالغ تھے) اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ کی راہ لی۔ اور تقریباً ۱۲۷۹ھ میں حج و زیارت سے فراغت کے بعد صوات پہنچ گئے اور کم و بیش دو سال میر مقصود علی کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ میر مقصود علی کے انتقال کے بعد تقریباً ۱۲۷۹ھ میں آپ کی ہاجرین نے باصرہ امیر منتخب کیا مولانا عبداللہ کا دور امارت بہت طویل اور پُر آشوب رہا۔ ۱۲۷۹ھ سے ۱۲۸۲ھ تک کل بیالیس برس یہ امیر رہے۔ اس درمیان میں سرد و گرم ہر قسم کے واقعات پیش آئے۔ ان سے خط و کتابت اور تعاون کے جرم میں

شمالی ہندستان میں گرفتاریوں اور خانہ تلاشیوں کا بازار گرم ہوا اور سازش کے پلنچ مقدمے یکے بعد دیگرے چلائے گئے (جن کی تفصیل آگے آتی ہے) سرچارپا سرکار انگریزی سے متعدد اہم معرکے پیش آئے۔

اس مختصر سی کتاب میں ان تمام واقعات کا مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اہم واقعات کی طرقت اشارہ پر اکتفا کریں گے۔ مولانا عبداللہ ^{۱۲۴۹ھ} _{۱۸۶۶ء} میں امیر منتخب ہوئے۔ زمام کار ہاتھ میں لیتے ہی تن وہی اور مستعدی کے ساتھ جماعت کی فوجی تربیت میں لگ گئے۔ "تیار یوں" کا اندازہ مندرجہ ذیل بیانات سے ہو گا۔

"لیکن ابھی دو برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ باغی نوآبادی نے پہاڑی آبادیوں میں خاصہ اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ ۱۸۶۶ء میں یہ ملک اسے آگے بڑھے اور ستھانہ کے ٹھیک اور پراکیت مقام پر وہ قلعہ بند ہو گئے۔"

اُس کے باوجود ہماری غیہ وفادار ہندوستانی رعایا باغیوں کے کیمپ میں آتی رہی، اور ۱۸۶۶ء میں یہ تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ حکومت پنجاب دوسری سرحدی جنگ کا مشورہ دینے پر مجبور ہوئی۔ حقیقت میں صورت حال یہ ہو چکی تھی کہ وزیر ہند نے یہ خیال ظاہر کیا کہ باغیوں کو جلد یادیر بڑو شمشیر کا لٹا پڑے گا

اور جب تک یہ ہماری سرحد پر ہیں، مستقل خطرہ کا باعث بنے رہیں گے۔
 ”اُس وقت تو کوئی جنگی مہم جاری کرنا ممکن نہیں تھا لیکن پچھلے
 پھر اپریل ۱۸۶۳ء میں حسب دستور برطانی حدود کے اندر
 لوٹ اور غارت گری میں مشغول پاتے ہیں۔

اُسی سال جولائی میں انھوں نے دیدہ دلیری کے ساتھ ستمخانہ
 کی چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ اور ہمارے حلیف سردار امب کو
 تہدید آمیز پیغام بھی بھیجے۔ اُس پاس کے قبائل نے پھر مذہبی
 دیوانگی کے پیچھے اپنی وفاداری کی بھینٹ چڑھا دی اور ہمارے
 معاہدہ کا ذرہ برابر بھی خیال نہ کیا۔ باغیوں کی نو آبادی کا ایک
 مرتبہ پھر سرحد میں بول بالا ہو گیا۔ ۷ ستمبر ۱۸۶۳ء کو جہلولوں
 کی ایک جماعت برطانی علاقے پر چڑھ آئی اور ہماری رستہ
 دکھانے والی فوج کے کیمپ پر شہ خون مار کر انھوں نے کھلی
 جنگ کا سیکنل دے دیا۔

یہ سب ۱۸۶۳ء کی جنگ امبیا کی تہید تھی۔ اصل معرکہ اور اس کے
 اسباب و نتائج کا تفصیلی ذکر آگے آتا ہے۔ یہاں یہ دکھانا مقصود تھا کہ مولانا

عبداللہ کے امیر ہوتے ہی حالات بدلنا شروع ہو گئے تھے۔

ہنٹر کے بیانات تو بہر حال مبالغہ سے خالی نہیں۔ صورت حال کی صحیح واقفیت کے لئے ایک دوسرے واقف کارانگریز کا درجہ ذیل بیان کافی ہوگا۔ یہ کسی خدمت کے سلسلے میں ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ سہی علاقے میں موجود تھا اور اس کے بیانات بھی ایک حد تک مبالغہ اور ظن و تخمین سے خالی ہوتے ہیں۔

یہ لوگ اس وقت مجاہدین کے لیڈر ہیں، جو صحیح تخمینہ کے مطابق بارہ چودہ سو کے لگ بھگ ہوں گے۔ ان کا مقصد، جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں، ہندستان میں اسلام کو از سر نو قائم کرنا ہے۔ اور اپنے مستقر میں یہ لوگ سختی کے ساتھ شریعت کے پابند ہیں۔ انھوں نے فوجی تنظیم کر لی ہے اور اسلحہ سے آراستہ ہیں۔“

معرکہ ابدیل ۱۸۶۳ء | مجاہدین اور سانگریزوں کی لڑائیوں میں دورہ ابدیل کی لڑائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ برطانی افسروں نے بڑے طنطنے کے ساتھ چڑھائی کی تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ انھیں اپنی مہم میں سخت ناکامی ہوئی۔ اسی لئے ان کے مورخ مجاہدین کی تعداد اور سامان جنگ کے متعلق طرح طرح کی مبالغہ آرائیوں سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:-

”۱۸۶۳ء کی مہم نے بڑے نقصان کے بعد ہمیں یہ سبق دیا کہ جہاد لوں کی چھاؤنی کے خلاف معرکہ آرائی کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دنیا کی بہترین جنگجو قوموں کے ۵۳ ہزار افراد سے لڑائی مول لی جائے۔“

گوہنٹر صاحب نے اپنے بیان کی تائید میں سرکاری رکارڈ کا حوالہ دیا ہے کہ پھر بھی یہ بیان حد درجہ مبالغہ آمیز ہے۔ اگر سرکار کی حریف فوج ۵۳۰۰۰ یا ۶۰۰۰۰ ہوتی، اور وہ بھی بقول گوہنٹر صاحب دنیا کی بہترین جنگجو قوموں کی، تو جنرل چیمبرلین سات ہزار کی مختصر فوج لے کر حملہ کی جرأت کس طرح کرتے؟

یہ ساری داستان سرائی اس لئے کی گئی ہے کہ اہلیا کی گھائی پریچرین کا حملہ ناکام رہا اور وہ خود بھی بڑی طرح زخمی ہوا۔

”حقیقت یہ ہے کہ حملے کی اسکیم ناکام رہی۔ اصلی خیال یہ تھا کہ گھائی کے ذریعے ناگہانی حملہ کر کے سامنے کی وادی پر قبضہ کر لیا جائے۔“

امپریل گورنمنٹ کا حکم تھا کہ تمام فوجی نقل و حرکت ۱۵ نومبر تک ختم ہو جائے اور یہاں ۱۴ نومبر تک ہماری فوج آگے بڑھنے سے قاصر تھی۔“

”یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ باغیوں اور پناہ گزینوں کی ایک نو آبادی اندرون ملک کے بغاوت پسند اور مذہبی دیوانوں کی مدد کے سہارے

اور تعصب و جنون کے جوش میں کھلم کھلا مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے۔ لیکن یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ ایک مہذب اور آپ لوڈیٹ لشکر کے مقابلہ میں یہ لوگ خواہ کچھ دیر کے لئے بھی کس طرح جمے رہتے ہیں۔ اس کی توضیح کے لئے اُس علاقے کی جغرافیائی پوزیشن سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

اب اصل معرکے کی کچھ تفصیلات ملاحظہ ہوں :-

”۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو جنرل میجر چیمبرلین Sir Neill

Chamberlain کی سرکردگی میں سات ہزار برطانوی سپاہ، توپ خانہ اور دوسرے سامان حمل و نقل سے آراستہ و پیراستہ تھم پر روانہ ہوتی ہے۔ اور اس کروڑ کے ساتھ کہ صرف اس فوج کے آرام و آسائش کی خاطر پورے پنجاب کا خون چوس لیا گیا تھا۔“

”دوسری شام کو ایک دستہ اہلیہ کی گھاٹی تک پہنچ گیا۔ ہماری پشت پر کافی سپاہ اور توپ خانے تھے۔ اور یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ حملہ آور فوج کی مدد کا اتنا کافی انتظام موجود تھا۔ اس لئے کہ ۲۰ کو جنرل نے محسوس کیا کہ جن قبائل کی دوستی پر اسے اعتماد تھا، وہ ڈالواں ڈول ہو رہے ہیں۔ اور دو روز بعد اس نے حکومت کو بتا دیا کہ فوج گھاٹی کو عبور رکئے بغیر رک گئی ہے۔ ۲۳ کو قبائل نے اپنی مخالفت کا اعلان کر دیا۔ اور چند

دن بعد صدیات کے مذہبی لیڈر نے بھی دشمن کے ساتھ اپنی رفاقت کا اعلان کر دیا۔ اس دوران میں سرحد سے حکومت کو ملک کے لئے تاریخی مہمیں ہونے لگی۔ فیروز پور رجمنٹ کا ایک دستہ روانہ ہوا۔ ایک دوسرے پیادہ دستہ نے پشاور سے کچھ کاخ کیا۔ سیالکوٹ اور لاہور سے بھی ملک روانہ ہوئی۔ تین ہفتوں کے اندر پنجاب کی چکیاں سپاہ سے اس طرح خالی ہو گئیں کہ میاں میر کا لمانڈنگ افسر مشکل سے چوبیس سنگینوں کی سلامی پیش کر سکا۔

”ادھر قبائل ہماری مختصر سی فوج کو گھیرے جا رہے تھے۔ آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ پیچھے ہٹنا شکست سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ ہماری اس پوزیشن سے ان لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا، جو پہاڑی لڑائیوں ہی کے ماحول میں پل کر جواں ہوئے ہیں۔“

”ایک ایک دن کی تاخیر دشمنوں کی امیدوں اور مجنوناں جوش میں اضافہ کر رہی تھی۔ ملک کے باوجود ہمارے جرنل کے لئے آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ہفتوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانی فوج مرعوب ہو کر درہ کے اندر دہکی بیٹھی ہے اور وادی چملا (Chumla) میں بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اس اثنا میں باجوڑ کے قبائل کے مل جانے سے

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

شمن کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اور اس طرح ہماری فوج کا ہر اوں میسرہ
(بایاں بازو) اور عقب کی آمدورفت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ ۸ نومبر کو
حکومت پنجاب نے نہایت بے صبری کے ساتھ دریافت کیا کہ اگر جنرل کو
۱۶۰۰ پیادہ فوج کی مزید ملک بھیجی جائے، تو کیا وہ ملک کی جہادی نوآبادی کو
تباہ کرنے کے لئے اقدام کر سکے گا؟ ۱۲ نومبر کو جواب آیا کہ آگے بڑھنا اس
وقت قابل عمل ہو سکتا ہے، جب ہمارے پاس مزید دو ہزار پیادہ فوج
اور کچھ توپیں ہوں۔ ساتھ ہی یہ مایوس کن پیغام بھی ملا کہ جنرل صاحب اس
وقت تک ملک پر فوج کشی کے خلاف ہیں، جب تک درمیانی قبائل سے
صفائی نہ ہو جائے۔

”ساکے سرحدی علاقے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ۱۷ نومبر کو حکومت
پنجاب نے اپنی فوجی چوکیوں کو یہاں تک خالی پایا کہ والٹھرائے کیمپ کے
حفاظتی دستے کا ایک حصہ عاریتہ مانگنا پڑا۔ نیز سواروں اور پیادوں پر
مشتمل ملٹری پولیس کی ایک جماعت، مواصلات کی حفاظت کے لئے بھیجی
گئی، جو دشمنوں کی وجہ سے خطرے میں تھے.....
۱۷ نومبر تک حالات اس قدر بگڑ گئے کہ برطانوی ہندی فوج کے
کمانڈران چیف نے جلدی سے لاہور پہنچ کر ریلوے کی ٹرانی اور سربراہی اپنے ہاتھ
میں لے لی۔“

”حقیقت یہ ہے کہ یہ ہم ناکام ہو چکی تھی..... اور بجائے اس کے کہ کھلے میدان میں لڑائیاں ہوتیں، جن میں مہذب [۶] لڑائی کے تمام ذرائع کام میں لائے جاسکتے، ہمیں ایک بڑے پہاڑی علاقے میں مدافعتی تدبیریں کرنی پڑیں۔ اسی روز پنجاب گورنمنٹ نے درخواست کی کہ ۱۵۰ آدمیوں کا ایک اور دستہ سرحد بھیجا جائے۔ ادھر جنرل چیمبرلین کا ۱۹ تاریخ کو ایک تار ملا جس سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ ملک بعد از وقت نہ ثابت ہو۔“

”۸ مارچ دشمن نے زور و شور سے ہم پر حملہ کیا اور ہماری ایک چوکی پر قابض ہو گئے۔ افسروں کے علاوہ ہمارے کل ۱۱۴ آدمی مقتول اور مجروح ہوئے اور ہمیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوسرے دن غنیم نے ایک اور چوکی پر قبضہ کر لیا، جسے پھر ایک خونریز لڑائی کے بعد واپس لے لیا گیا۔ لیکن اس کی قیمت گراں پڑی۔ افسروں کے علاوہ ۱۲۸ آدمی مارے گئے یا بالکل ناکارہ ہو گئے۔“

”۱۹ نومبر تک حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ خبرل نے تار دیاب فوجیوں کو پورا ہینہ دن رات سخت محنت کرنا پڑی ہے۔ تازہ دم دشمنوں کا نقصان کے ساتھ مقابلہ کرنا حوصلہ شکن ہے، ہمیں ملک کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارے لئے دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اگر تازہ دم فوج ان دل برداشتہ اور

زخم خوردہ دستوں کی جگہ لے سکے، تو ان دستوں کو میدان میں بھیج کر، ان سے امداد کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ اشار ضروری ہے۔“

یہ تفصیلات ہنٹر کی کتاب سے لی گئی ہیں۔ ممکن بلکہ بہت ممکن ہے کہ ان میں کچھ مبالغہ بھی ہو۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ملک کی نہم میں سرکار کو بڑی ناکامی ہوئی اور برطانوی فوج کا کافی نقصان ہوا۔ اس کی تائید مولوی محمد جعفر صاحب ٹھانیسری (اسیرانڈمان) کے ایک محتاط بیان سے بھی ہوتی ہے، جو ان کی کتاب تواریح عجیب میں ضمنی طور پر آگیا ہے:-

”آخر ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۰ھ سرحد غربی [۹] ہند پر خود سرکار کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہوئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ اہلیے کی گھائی میں جا کر فوج سرکار کو بہت تکلیف پہنچی۔ مار [۹] کی مداخلت بیجا کے سبب سے اخوند سوات (صوت) بھی بغرض اعانت اہل قافلہ [یعنی مجاہدین] اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر شامل جنگ ہو گیا۔ ملکی افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے مقابلہ سرکار پر لڑ پڑے۔ سخت جنگ ہونے لگا [لگی] خود جنرل چیمبرلین صاحب مجروح شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں سے فوج کھینچ کر سرحد بھی گئی۔ ادھر یہ گریا گرمی تھی۔ ادھر لارڈ ایچن صاحب وائسرائے ہند

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

چمبے کے پہاڑ پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر ایک بیک
مرکٹے۔

جب انگریزی فوج بلاوجہ زبردستی سے اپنی عملداری کے باہر
یاغستان غیر عملداری میں چڑھائی کر کے گئے [گئی] تو سارا ملک یاغستان
مع اخوند سوات [صوات] کے سرکار سے بگڑ گیا۔ اور درہ اہیلہ پر سخت
”لڑائیاں ہوئیں اگر لاکھوں روپے رشوت دے کر ان بگڑے ہوئے
افغانوں کو راضی نہ کیا جاتا، ایک آدمی بھی فوج انگریزی کا واپس نہ آتا۔
”یہ ظاہر اور طبعی بات ہے کہ جب کوئی کسی غیر ملک میں اپنی حد سے
باہر زبردستی لڑنے جائے گا تو اس ملک والے اپنے بچاؤ کو ضرور مقابلہ
کریں گے۔ اس سبب سے اس فضول اور زبردستی کے جنگ میں سرکار کا
بہت نقصان ہوا۔“

لاکھوں روپیہ رشوت دے کر افغانوں کو راضی کرنے کی تفصیل خود
سرکار کے ترجمان ڈاکٹر ہنٹر کی زبانی سنئے، تو اچھا ہے۔ یہ پہلے بھی کہیں عرض
کیا جا چکا ہے، کہ ان ”مجاہدینِ مہربطین“ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ
بار بار دھوکا کھانے کے باوجود خواینین پر اعتماد کرتے تھے۔ جس طرح خود
سید شہید اور ان کے خاص رفیقوں سے یہ چوک ہوئی کہ انھوں نے افغانی
قبائل کی تربیت و اصلاح کی کوشش اور اس کے نتائج کا انتظار کئے

بغیر ان کے علاقے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا، اسی طرح ان کے ماننے والوں نے غلطی کی کہ پہلے خود ہندستان کے اندر فکری و عملی انقلاب کی دعوت دینے کے بجائے سرحد پار جا کر خفیہ ذرائع سے عملی تحریک کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ ہمارے نزدیک دین کی تجدید و اقامت کے لئے ایک کھلی مہم کی عمومی دعوت، اصلاح اور فکری و اخلاقی انقلاب کی عام تحریک اور افکار و اخلاق کی تعمیر جدید سے کام شروع ہونا چاہئے۔ اور اس کے لئے صحیح مقام سرحد پار نہیں، بلکہ ہندستان کے شہر اور دیہات ہیں۔ بہر حال تحریک کی ناکامی کے اسباب پر ہم آگے چل کر پھر لکھیں گے۔ یہاں جنگ اہیلا کے عبرت ناک حشر کی داستان ملاحظہ ہو۔ خود منتر صاحب راوی ہیں۔

لیکن جو کام ہماری سپاہ سے نہ ہو سکا، وہ ہماری ڈیپلو میسی نے کر دکھایا۔ سرحدی قبائل کا اتحاد ڈالواں ڈول ہوتا ہے۔ ۲۵ نومبر کو پشاور کے کمشنر نے بنیر کے بعض قبیلوں کو الگ کر لیا۔ ان کے علاوہ دو ہزار کے ایک اور دستے کو گھر جانے پر راضی کر لیا۔ نیز صدقات کا سردار اپنے خاص ماننے والوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا گیا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برکشتگی کو بھانپ کر خود علیحدہ ہو گئے اور جاتے جاتے باقی ماندہ لوگوں کے درمیان بے اعتمادی کا بیج بونگئے۔ ۱۰ دسمبر تک بے اعتمادی کا رنگ کھلا۔ ۱۰ دسمبر کو قبائل بنیر کا بڑا جرگہ کمشنر کے ہاں آیا، لیکن شرائط نہ ملے ہو سکے۔ اس منتر کی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے (بقیہ ۲ پر)

مقدمہ سازش انبالہ کے سلسلے میں سنایا اب ہو کر انڈمان بھیجے جا رہے تھے۔
مولانا عبدالرحیم (ف ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۲ء) اس گفتگو سے مصالحت کا ذکر ان
”مخاطب“ لفظوں میں کرتے ہیں:-

”اس وقت ایک اور امتحان اس نالائق پر خاص کر کے کمشنر
صاحب و ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہوئی کہ بذریعہ کمترین مولوی
عبداللہ ساکن افغانستان سے پیغام مصالحت کیا جائے کہ جن سے یہ مقام
انبیلہ سرکار سے جنگ ہوئی تھی اور وہ اس کمترین کے چچا زاد بھائی
تھے.....“

اس گفتگو سے مصالحت کا حشر جو کچھ ہوا ہوگا، وہ مولوی عبدالرحیم
صاحب کی ”غاموشی“ سے ظاہر ہے۔

اس مہم کے بعد چار سال امیک گو نہ غاموشی رہی۔ پھر ۱۸۶۷ء
میں ”چھیڑ چھاڑ“ کا ذکر آتا ہے۔ ۱۸۶۷ء میں باضابطہ لشکر کشی کے واقعات
ملتے ہیں۔ ہنٹر نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:-
بہر حال اب کے برطانوی حکام بالکل تیار تھے۔ ۸ ستمبر کو مرکزی
حکومت نے قبائل کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کی اجازت دے دی۔
۳۰ اکتوبر کو کمانڈران چیف کی زیر ہدایت اور جنرل وائلڈ کی قیادت میں
فوجیں روانہ ہوئیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے قبائل کے نام اعلان شائع کیا، جس میں بیان

کیا گیا کہ بعض ایسے قبیلے جن پر ہم نے کوئی زیادتی کی تھی اور نہ ان کے علاقے میں کوئی مداخلت کی تھی، ہماری چوکی پر حملہ کرنے کے بعد کس طرح تلواروں اور جھنڈوں کے ساتھ ہمارے علاقے میں آگھے تھے اور ہمارے بعض دیہاتوں کو جلا دیا تھا، لہذا اب ان کی سرکوبی ضروری ہو گئی ہے۔

برطانوی حکومت جسے بہت پریشان کیا جا چکا ہے، اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتی اور اب آپ لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس کا جواب ^{۱۵} دیں۔

جنگ شروع ہوئی۔ اور برطانوی اقدام شروع ہوا۔ مگر سابق تجربوں کی روشنی میں دوسرے ڈھنگ پر۔ اب کے پنجاب کی فوجی چھاؤنیاں کمزور

نہیں کی گئیں۔ بلکہ شمالی مغربی صوبوں [موجودہ صوبجات متحدہ] سے فوجیں منگوائی گئیں۔ اصل لڑنے والا دستہ چھ سات ہزار باقاعدہ فوج پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ سرحد کی فوج تقریباً دو گنی کر دی گئی اور اس طرح پر ہندستان کی برطانی سپاہ کا کل سرسبد پہاڑی جہادیوں کی سرکوبی میں لگ گیا۔

لیکن ان سب طنطنوں کے بعد، ہنٹر صاحب کے یہ جملے قابل

غور ہیں :-

”اس کے باوجود ہم اب کے بھٹی خرابی“ کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہے

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس بغاوت کے فوری اسباب میں مذہب کا کہاں تک دخل تھا۔ لیکن پنجاب گورنمنٹ نے ہم کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے افسوس ظاہر کیا کہ ہم ختم ہو گئی اور ہم نہ تو اس قابل ہو سکے کہ ہندستانی جہاد کو نکال باہر کریں اور نہ انھیں مطیع کر کے ہندستان ہی واپس جانے پر آمادہ کر سکے۔

یہ آخری ہم ہے، جس کی تفصیل ہم تک پہنچی ہے۔ ۱۸۷۹ء کی ایک فوج کشی کے متعلق ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
 ”ہنٹر نے ۱۸۷۹ء میں لکھا تھا کہ جب جنگ ہوگی۔ اور جلد یادیر افغانوں سے جنگ چھڑنا ضروری ہے۔ تو ہمارے سرحد کی باغی نوآبادیاں دشمن کے لئے بہت کا آمد ہونگی۔ لیکن ۱۸۷۹ء کے پورے افغان چڑھائی میں نہ تو ستھانہ کی نوآبادی اور نہ شورش پسند ہابیوں کا کہیں ذکر آیا۔“ پھر ۱۸۷۹ء کی بابت ایک دوسرے صاحب ارشاد فرماتے ہیں:-

”۱۸۷۹ء تک یہ لوگ خطرے سے خالی نہیں تھے۔“

۱۵ اردو ترجمے میں جانے یہ جملہ کیوں حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۷ ہنٹر: ص ۳۳ ۲۸ انڈین مسلمانز: ص ۳۴

۲۹ E. RENATSEK کا مقالہ ”وہابیت کی تاریخ عرب اور ہندستان میں“ مندرجہ

جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ لمبئی جلد ۱۴ ص ۳۶

۳۰ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ جلد ۴ ص ۱۰۸۹

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

بہر حال ۱۸۷۸ء کے بعد رابطین سرحد کے حالات اب تک منضبط نہیں ہو سکے ہیں۔ تاریخ کے طالب علم کے لئے یہ تحقیق کا دلچسپ موضوع ہے۔ جہاں تک چھان بین اور ذاتی تحقیق سے معلوم ہو سکا، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

مولانا عبداللہ صادق پوری اپنی زندگی کے آخری لمحہ حیات تک اس راہ پر ثابت قدم رہے۔ ان کی وفات شعبان ۱۳۲۲ھ نومبر ۱۹۰۲ء میں ہوئی ان کے بعد، ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالکریم (مولود غالباً ۱۲۵۵ھ) کو تنظیم جماعت اور عسکری امارت سپرد ہوئی۔ افراد جماعت آپ سے مطمئن تھے۔ دانشمندی اور مصلحت اندیشی سے اپنی زندگی گزاری۔ ان کا انتقال ۲۵ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ کو صدمات بنیہ میں ہوا۔

ان کے بعد مولانا عبداللہ کے پوتے غازی نعمت اللہ شہید منصب امارت پر متمکن ہوئے اور اپنی حد تک بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ان کے دور میں مجاہدین رابطین میں کچھ نئے لوگ آکر شامل ہو گئے، جس سے آپس میں تلخی اور شکر و نحی پیدا ہو گئی۔ اور یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ نعمت اللہ صاحب کو ایک مدعی جہاد مسلمان نے شہید کر دیا (۴ مئی ۱۹۲۱ء)۔

۱۔ نعمت اللہ شہید کی شہادت کے باب میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بعض تیز مزاج نوجوانوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا یا پیدا کر دیا گیا تھا کہ نعمت اللہ انگریزوں سے مل گئے ہیں راقم کا اشارہ جن صاحب کی طرف ہے۔ ان کے ایک معتقد نے راقم سے اس الزام کی شکایت کی اور ان کو بری الذمہ قرار دیا۔ لیکن شہادت اور تفصیلات طلب کرنے کے باوجود وہ اب تک میری مدد نہیں کر سکے۔

اس سلسلے میں جن صاحب پر تحریک اور ورغلائے کاشیہ کیا جاتا تھا، اب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے۔ راقم نے خود ان سے مل کر تحقیق حال کی کوشش کی، ان کے انکار اور مدلل صفائی کے باوجود ہمارا اطمینان نہیں ہوا۔ بہر حال اب وہ بھی وہاں پہنچ چکے ہیں، جہاں کوئی چیز مخفی نہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزت عقیب کرے اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔

غازی نعمت اللہ شہید کے بعد مولانا عبد اللہ کے دوسرے پوتے سید رحمت اللہ صاحب مہربان کے امیر مقرر ہوئے اور تیس سال سے اس منصب پر فائز ہیں۔ ان کے علاوہ غازی نعمت اللہ کے صاحبزادے سید برکت اللہ بھی جماعت میں نمایاں ہیں، جنھیں عام طور پر شہزادہ کہا جاتا ہے اور ان دونوں کے ساتھ ماننے والوں کی ایک مختصر تعداد وہاں مقیم ہے اور یہی نام امامت و امارت اب تک قائم ہے۔

”رستی جل چکی، مگر بل باقی ہیں“

۱۵ اس لقب ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مجاہدین کی اولاد میں روح کہاں تک کار فرما ہے؟

پانچواں باب

ہندستان کے اندر

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۶۶ھ) کے بعد مولانا ولایت علیؒ نے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور پوری عجمت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تجدید کی (۱۲۶۶ھ) شروع شروع ملک کے اندر اور باہر (یعنی جہاد بالسیف اور مال و اسباب کی فراہمی) دونوں کام مولانا ولایت علیؒ ہی کی نگرانی میں چلتے رہے۔ مگر جب وہ مستقل طور پر بیرون سرحد کی ہجرت کر گئے (۱۲۶۵ھ یا ۱۲۶۶ھ) تو ان کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین صاحبؒ نے اندرونی نظم و تبلیغ کا کام سنبھالا۔ اور تمام کاموں میں لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ آپ کی وفات تک (۱۲۶۷ھ) اندرون ملک کی رہنمائی اور سربراہی یکسر آپ کے ہاتھ میں رہی۔

ان کے بعد مولانا یحییٰ علی جعفری صادق پوری نے نظم و نسق کو سنبھالا اور ایک عرصہ تک تحریک کو حیرت انگیز طریقے پر چلاتے رہے۔ تا آنکہ ۱۸۶۵ء میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ انبالہ میں مقدمہ چلا۔ پھر انڈمان بھیجے گئے (جنوری ۱۸۶۷ء) اور وہیں ۱۸۶۸ء میں انتقال ہوا۔ (ان کے حالات اور کارناموں کا مختصر بیان آگے آتا ہے)

مولانا یحییٰ علی کی گرفتاری یا مقدمہ سازش انبالہ کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ نے کام سنبھالا۔ تا آنکہ ۱۸۶۵ء میں ان پر بھی مستقل مقدمہ چلایا گیا۔ وہ بھی انڈمان بھیجے گئے، اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ (۲۸ رذی الحجہ ۱۲۹۰ھ ۱۸۸۱ء)

مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد مولوی مبارک علی صاحب تنظیم کے ذمہ دار ہوئے۔ یہ صادق پور کے نہیں تھے، بلکہ اطراف حاجی پور ضلع مظفر پور کے رہنے والے تھے۔ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) یا مولانا فرحت علی (ف ۱۲۷۴ھ) سے بیعت تھی۔ جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں یہیں رہ پڑے۔ مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد جماعت کا کام ۱۲۳۸ھ۔ ذاتی حالات کی تفصیل کے لئے تذکرہ صادق (۶۳-۷۸) کی طرف رجوع کیا جائے۔

۵۲ مولود تقریباً ۱۲۲۲ھ۔ تفصیل کے لئے تذکرہ صادق (۵۵-۶۴) ملاحظہ کی جائے۔

ہاتھ میں لینا بڑی آزمائش کا کام تھا۔ پٹنہ کی زمین خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں دار و گیر کا سلسلہ جاری تھا۔ قسمت برگشتہ کی طرح سرکار کی چشم التفات کیا پھری، عظیم آباد کے رئیسوں اور جاہ پسندوں کے تیور بھی بدل گئے۔ ایک عجیب قیامت کا سماں تھا ان حالات میں مولوی مبارک علی صاحب نے جان جو کھم میں ڈال کر تنظیم جماعت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک عرصے تک اپنا فرض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ مقدمات سازش کی پیروی میں کبھی انھوں نے مولوی محمد حسن صاحب ذبیح (فرزند مولانا دلایت علی) کا ہاتھ بٹایا۔

جب آپ ضعیف ہوئے، تو اپنی نیابت کے لئے مولوی محمد حسن صاحب کو تجویز و منتخب کیا۔ اور ان کی تربیت میں پوری کوشش کی مگر تنظیم کا کام ان دنوں اتنا آسان نہیں تھا کہ مولوی مبارک علی صاحب سرکار کی نظر عنایت سے محروم رہ جاتے۔ کسی جیلے سے، انھیں بھی حبس و زنداں سے نوازا گیا۔ (۱۸۶۸ء) غالباً ان کی گرفتاری ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) کے اواخر میں ہوئی۔ اس لئے کہ مقدمہ سازش پٹنہ (۱۸۶۸ء) کے ایک سرکاری گواہ ہریش چندر مگرچی (کلرک ڈاک خانہ پٹنہ) کا بیان ہے کہ انھوں نے ۲۷ مئی ۱۸۶۸ء کو دو خط ریشٹری کے ذریعہ

دہلی بھیجے تھے۔ اور جس کی رسید نہ ملنے پر انھوں نے ۲۸ نومبر کو ایک باغیابطہ درخواست بھی دی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خطوط پر سنسر پیشتر سے ہو رہا تھا۔ پھر ۱۸۷۸ء کے مقدمہ سازش میں بھی انھیں دھر لکھیا گیا۔ سزا تو عبور دریاے ستور کی ہوئی۔ مگر انھیں قید میں اتنی تکالیف و اذیت دی گئی کہ وہیں جاں بحق ہو گئے۔ مولوی مبارک علی صاحب پر یہ بھی الزام تھا کہ انھوں نے جہاد پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔
مولوی مبارک علی صاحب کی گرفتاری کے بعد مولوی محمد حسن صاحب ذبیح خلف مولانا ولایت علیؒ نے کام کو سنبھالا۔ مولوی محمد حسن صاحب کا حال

۱۹ سال وفات نہ معلوم ہو سکا۔ سرکاری کاغذات سے ۱۸۷۶ء کی گرفتاری پھر ۱۸۷۸ء کے مقدمہ سازش میں شمولیت اور سزایابی کا ذکر آتا ہے۔ پھر کچھ پتہ نہیں ملتا۔ قید خانے کی اذیتوں اور انھیں تکالیف کے عالم میں واصل بحق ہونے کی روایت نمائندان صادق پور کے ایک نہایت معتبر بزرگ (مولوی محمد موسیٰ صاحب) خلف مولانا یحییٰ علی صاحب مرحوم کی زبانی ہے ۱۹۴۲ء میں ان کی زیارت ہوئی تھی۔ عمر ۸۰ سے اوپر تھی اور مہوش و حواس بالکل بجا ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ ان کے بزرگوں کا کیا حال ہا ہو گا۔ قرآن بھی یہی ہیں کہ مولوی مبارک علیؒ اندمان جانے سے پہلے ہی قضا کر گئے، اس لئے کہ مولوی عبدالرحیم صاحب نے اکثر فقائے ابتلا کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہ وہاں ہوتے، تو اتنی اہم شخصیت کا تذکرہ ضرور آتا۔ مزید یہ کہ ۱۸۸۳ء میں جب اسیران بلار ہا ہوئے، تو اس وقت اندمان میں صرف چھ آدمی تھے، جن کے نام لے آئیں گے ان میں مولوی مبارک علیؒ کا نام نہیں آتا۔ حالانکہ ان کے صاحبزادے تبارک علیؒ (ماخوذ مقدمہ سازش

۱۸۷۸ء کا نام ان چھ میں آتا ہے) ۱۸۷۵ء وہابی ٹرائل: ص ۷۸

۱۸۷۵ء مولود ۱۲۶۴ء تفصیل کے لئے تذکرہ صادق: ص ۱۵۲-۱۶۰

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

عجیب و غریب اور سبق آموز ہے۔ وہ ابھی بے فکری اور تنعم کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ نہ ہو گی کہ خاندان کا طاہری طمطراق ختم ہونے لگا، اور آخرت میں سرخروئی کا سامان تیار ہوا۔ مقدمہ سازش انبالہ (۱۸۶۴ء) کے سلسلے میں جب ان کے چچا اور بھائی مولانا عبدالرحیم گرفتار ہونے لگے، تو انھوں نے مولوی محمد حسن کو بلا کر کہا:۔

”اب میں جاتا ہوں۔ لو اب گھر بار کی تم خبر گیری کرو“

یہ سننا تھا کہ اس سولہ سالہ نو عمر لڑکے کا رنگ ہی بدل گیا۔ ایک طرف ”سازش“ کے مقدموں کی پیروی میں کلکتہ سے لے کر انبالہ تک کی دوڑ، دوسری جانب ایک بڑے کنبے کے بچوں، بچیوں اور عورتوں کی خبر گیری تاز کے پلے ہوئے بچے اور بچیاں، جن کے باپ دادا، چچا، ماموں شہید ہو چکے تھے یا میدان جہاد میں تھے، اور باقی ماندہ اب سرکاری مہمان خانے کو بھیجے جا رہے تھے، جن کے گھر بار اور جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔ بزرگوں کی قبریں تک اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھیں۔ زمانے کی نگاہ بدل چکی تھی۔ ان جاں گسل حالات میں، مولوی محمد حسن مرحوم نے وہ کردکھایا، جو بڑے بڑوں سے نہ ہوتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس کم سنی اور

۱۔ مولوی محمد حسن صاحب مرحوم کی ان عجیب العقول کوششوں کے صلے میں ان کے کلکٹر مسٹر راونٹن نے اپنے میمورنڈم میں انھیں ”بڑا بد معاش“ (A Great rascal) کے لقب سے یاد کیا ہے (کلکتہ گزٹ:۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)

کے کسی کے عالم میں انھوں نے لندن تک سے پیروی کے لئے بیرسٹر کس طرح بلوائے؟ مزید کہ جزائر انڈمان جا کر اسیرانِ بلا کی مزاج پرسی بھی کی۔ مقدّمات وابتلا کا حال تو اپنی جگہ پر آئے گا۔ مولوی محمد حسن مرحوم کے متعلق یہاں اتنا اور عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ انھوں نے خاندان کی تعلیمی پالیسی کے بدلنے اور سرسید کی طرح حکومت کی برہمی دور کرنے کی بڑی کوشش کی۔ ۱۸۸۳ء میں صوبہ کا پہلا مسلم ہائی سکول (محمد بن اینگلہ عرب سکول) کے نام سے قائم کیا، جو آج تک چل رہا ہے۔ نیز ٹیٹنہ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے نام سے صوبے کا پہلا آرڈو اخبار جاری کیا۔ اپنے دو عزیزوں کو لندن تعلیم کے لئے بھیجا۔ سرکار نے بھی ۱۸۸۶ء میں شمس العلماء کے خطاب سے ان کو شمشوں کی داد دی۔ انھیں کی روش پر مولوی محمد علی (مولود تقریباً ۱۲۶۲ھ) خلف مولانا یحییٰ علی صاحب، جو جہاد سرحد میں شریک ہو چکے تھے، نے اپنا نام امجد علی رکھ کر جدید تعلیم حاصل کی اور ایم۔ اے کیا اور دنیا میں شمس العلماء مولانا امجد علی ایم۔ اے (پروفیسر گورنمنٹ میونسپل کالج الہ آباد) کے نام سے متعارف ہوئے۔ (وفات ۱۳۴۱ھ) اسی طرح مولوی عبد القدیر (مولود ۱۲۵۹ھ) خلف مولانا احمد اللہ رحم نے بھی میدانِ جہاد سے واپسی کے بعد اشرف علی نام بدل کر عربی علوم اور طب کی تحصیل کی۔ پھر ام۔ اے تک نئی تعلیم حاصل کی۔ اور مختلف مقامات میں نگاہِ خسروانہ سے بچ بچ کر نیازِ مرست کی۔ ۱۳۲۶ھ میں وفات

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

پائی۔ پھر تو اس خاندان میں نئی تعلیم کی ایسی ریل پیل ہوئی کہ باید و شاید۔
شمس العلماء محمد حسن صاحب سے اور بھی ان کی قوم کو توقعات
تھیں، مگر واسطے افسوس کہ عین شباب کے عالم میں پیام اجل آگیا (ربیع الاول
۱۳۰۰ھ ۲ نومبر ۱۸۸۹ء) اس سلسلے میں ایک اور حقیقت کا اظہار کر دینا
مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض صاحبوں کو راز درون پردہ کا یہ
انکشاف پسند نہ آئے، مگر اب یہ حضرات تاریخ بن چکے ہیں، اس لئے
آنے والوں کے لئے صحیح معلومات فراہم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہئے۔
کہتا یہ ہے کہ مولوی محمد حسن صاحب کی اس تعلیمی پالیسی سے خاندان کے
تمام افراد خوش نہیں تھے۔ بعضے بعضے اصحاب متقشف عالم اور کٹر اہل
حدیث بھی تھے۔ مثال کے طور پر مشہور اہل حدیث عالم مولانا عبدالحکیم
صادق پوری (۱۲۶۱ھ - ۱۳۳۷ھ) خلف مولانا احمد اللہ اسیر ندوان
تواتنے سخت تھے کہ انھوں نے مولوی محمد حسن صاحب مرحوم کی نماز جنازہ
بھی نہیں پڑھی۔

مولوی محمد حسن صاحب کی زندگی ہی میں مولانا عبد الرحیم صاحب
اندمان سے واپس آچکے تھے (۱۳۰۸ھ) اس لئے خود بخود نظم و ارشاد کا
کام ان کی نگرانی میں چلنے لگا۔ اور حکومت کی سخت نگرانی کے باوجود
مولانا عبد الرحیم (ف ۱۳۴۱ھ) کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ اب غالباً یہ سلسلہ
بنیہ چکا ہے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ مولانا عبد الرحیم نے اپنے آخری

دورِ حیات میں، خاندان کے بعض افراد کی خاص طور پر تربیت کی تھی۔ وہ لوگ بحمد اللہ زندہ ہیں اور اپنے بزرگوں کے مسلک پر قائم۔

اندرونِ ہند کے اُمراء اور ناظمین کی فہرست ہم نے بالترتیب **نظام عمل** درج کر دی ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ یہ لوگ کیا کرتے تھے اور کس طرح کرتے تھے؟ سو اس کے متعلق بھی یہاں مختصر طور پر عرض کرنا ضروری ہے، تاکہ تحریک کا یہ اہم حصہ تشنہٴ بیان نہ رہ جائے۔

”کیا کرتے تھے؟“ کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ یہ اوپر بارہا گذر چکا ہے۔ یہ لوگ اندرونِ ملک اور خاص کر بنگال و بہار کے اضلاع سے آدمی اور رقم فراہم کر کے بھیجا کرتے۔ جو مبلغ اور محصل آدمی اور رقم کی فراہمی کا کام کرتے، وہی ترک بدعات اور اتباعِ سنت کی بھی تبلیغ کرتے

۱۔ مشرعیں اور سنہ نے دہائیوں کی سرگرمیوں اور باغبانہ حرکات کے سلسلے میں بنگال کے فرضی فرقہ، داد و میاں، ٹیٹو میاں اور حاجی شریعت اللہ وغیرہم اور ان کی تشددانہ اور غیر تشددانہ اعمال کا تذکرہ بڑے شد و مد کے ساتھ کیا ہے (ملاحظہ ہو اوکٹلے کا مقالہ ”ہندستان میں وہابی فتنہ“ کلکتہ ریویو: ۱۷۷-۱۷۸) یہ واقعات غالباً صحیح ہوں گے، مگر ہم اب تک سید صاحب کی جماعت سے اس کا رشتہ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (جلد ۲ ص ۵۹-۵۷) میں خان بہادر مولوی ہدایت حسین مرحوم نے فرائضی پر مقالہ لکھا ہے اور غالباً بنگالی ہونے کے باعث وہ زیادہ واقف ہوں گے۔ ان کے مقالے سے بھی سید صاحب کی جماعت سے داد و میاں اور حاجی شریعت اللہ کا تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً یہ اوکٹلے صاحب کے دماغ کی آبیج ہے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اس طرح پر حضرت سید شہیدؒ کی تحریک کے دونوں اجزاء (جہاد اور محمدیہ) ساتھ ساتھ انجام پاتے تھے۔

”اب رہا یہ کہ کیسے کرتے تھے؟“ سو اس کا جواب سننے کے لئے دل و

جگر چاہئے۔ حضرت سید صاحبؒ کی شہادت ۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔ اور

پٹنہ کا آخری مقدمہ سازش ۱۸۵۸ء میں چلا گیا۔ یہ چالیس برس کا عرصہ

سید صاحبؒ کے ماننے والوں کے لئے یکسو تک و دو اور جدوجہد کا زمانہ

تھا۔ اس کی سرگزشت بہت طویل ہے۔ نہ کسی میں سننے کی تاب ہے اور نہ اس دور آزادی سے پہلے

خانے کی اجازت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی مرد مومن نے اس

جماعت کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سر ولیم ولسن ہنٹر کی

کتاب ہندستانی مسلمان **The Indian Muslims** فرنگی

مورخوں کا مرجع ہے۔ اور خود اس کا زیادہ تر اعتماد پٹنہ کے کلکٹر مسٹر راؤ شاکی

اس یادداشت (**MEMORANDUM**) پر ہے۔ جو اس نے مقدمہ

سازش، پٹنہ (۱۸۵۸ء) کے سلسلے میں حکومت کے سامنے پیش کی تھی

یہ یادداشت ہمارے سامنے ہے۔ اور شروع سے آخر تک طرح طرح کی

مبالغہ آرائیوں اور افترا پردازیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بہر حال جہاں

تک ممکن ہو سکا ہے، راقم نے صحیح تعلیمات اخذ کرنے کی کوشش کی ہے،

جس کا خلاصہ نذر ناظرین ہے۔

اس سلسلے میں تمہید کے طور پر ایک بات اور عرض کر دی جائے، تو

شاید نامناسب نہ ہو۔ ہنٹر کی کتاب ۱۸۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور سرسید مرحوم (ف ۱۸۹۲ء) نے بروقت اس کا جواب بھی لکھا تھا۔ (۱۸۷۲ء) اور ان کی کوششیں مشکور بھی ہوئیں۔ نیز نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۰ء) نے اپنے مختلف رسالوں اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۲۲ء) نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ اور بعض تصنیفات کے ذریعہ الزام "جہاد و بغاوت" کی خوب تردیدیں کیں۔ لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہمیں مذہبی دیوانہ (FANATIC) اور غدار یا باغی (Disloyal) کے القاب پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے۔

یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ اور اپنی اپنی اصطلاح :-
 خردکانام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے، آپ کا خرن کرشمہ ساز کرے
 اب ان کے کام کا مختصر خاکہ ملاحظہ ہو :-

(i) ہر ہر گاؤں اور ضلع میں واعظوں کا اور اماموں کا تقرر جیسا کہ مولانا عنایت علی (ف ۱۳۰۶ء) کے حالات میں گزر چکا ہے۔
 (ii) چند چھوٹے مقامات کو ملا کر ایک بڑے امام یا مبلغ کی زیر نگرانی کر دیا جاتا تھا۔

(iii) ملک کے مختلف حصوں میں دیانت دار اور خوش حال تاجروں کے پاس اس نواح کی رقم جمع ہوتی (یہ رقمیں صدقات و اجبہ اور عام تبرعات دونوں قسم کی ہوتیں اور وہاں سے ہنڈلیوں اور دوسرے

ذرائع سے (کبھی کبھی خاص قاصدوں کی معرفت) پٹنہ، دہلی، تھانیسر، راولپنڈی وغیرہ تک یہ امانت پہنچائی جاتی، جہاں سے خاص ذرائعوں سے منزل مقصود تک ہدیے پہنچ جاتے۔ اس قسم کے تاجرینہ (بنگال) ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ میں خاص طور پر کام کرتے تھے۔ امیر خاں، حشمداد خاں (ساکنان پٹنہ) کا چمڑے کا بہت بڑا کاروبار کلکتہ اور پٹنہ میں تھا۔ جن پر اسی پاداش میں ۱۸۷۱ء میں مستقل مقدمہ چلایا گیا، اور لاکھوں روپے کا فرم تباہ کر دیا گیا۔

(۱۷) تبلیغی رسالے اور جہادی نظمیں بڑی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کی جاتیں۔ مثال کے طور پر مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ) کے رسالہ دعوت، مولوی خرم علی بلہوری کی مثنوی جہاد یہ اور مولانا اولاد حسن قنوجیؒ (ف ۱۲۵۳ھ) کے رسالہ راہ سنت کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ سید صاحبِ حج کے خلفاء میں تھے۔ ان کے علاوہ

سہ راون شاہ نے ان خاص ذرائع کی حسب ذیل تفصیل دی ہے۔

(۱) مولانا بخش (ساکن پٹنہ) محمد شفیع [اتہم سازش انبائہ بعد میں وعدہ معاف گواہ] میاں میر کیمپ، لاہور میں۔

(۱۱) عبدالکریم، [اتہم سازش انبائہ بعد میں وعدہ معاف گواہ] شفیع کا ایجنٹ راولپنڈی میں

(۱۱۱) نبی بخش - شفیع کا ایجنٹ (راولپنڈی)

(۱۷) احمد علی (ساکن جگڑی - بہار) پشاور۔

اس سلسلے کے مختلف بزرگوں نے ترغیب جہاد اور رد بدعات پر ختنے
رسالے اور کتابیں لکھیں، ان کا مفصل ذکر اور مضامین کی تفصیل یہاں
ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر سنئے۔

(الف) مولانا اولاد حسن قنوجی (ف ۱۲۵۳ھ) کے رسالہ راہ
سنت، (مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۵ھ) کے آخر میں منظومات اردو کا ایک
ضمیمہ ہے، جن میں ایک نظم کا ایک مصرعہ یہ ہے۔

”خیر خواہ کمپنی مردود ہے“

(ب) رسالہ جہاد یہ میں ایک شعر آتا ہے :-

فرض ہے تم پر مسلمانو جہاد کفار اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

(ج) رد شرک کے سلسلے میں مولوی خرم علی بلہوری کی ایک
نظم کے یہ شعر ملاحظہ ہوں :-

۱۔ جناب عبداللہ یوسف علی صاحب مترجم قرآن کریم نے اپنی کتاب (انگریزی عہد میں ہندستان کے

تمدن کی تاریخ ۱۸۴۸-۱۸۹۹ء) میں اس جماعت کی ان کوششوں کا مختصر ذکر کیا ہے، جو اس نے

اردو کی اشاعت اور ٹائپ پریس کے قیام کے سلسلے میں کیں (یعنی تبلیغ کے سلسلے میں اردو

طباعت و اشاعت کی جو بیش بہا خدمات غمنی طور پر انجام پائیں) آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ

ہمارے مترجم قرآن کریم کو یہ بھی خبر نہیں کہ بدنام وہابی حدیثوں کو کیا درجہ دیتے ہیں؟ مولوی کرامت علی

(ف ۱۲۹۹ھ) اور وہابیوں کا فرق بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں۔ ”اور (کرامت علی) حدیث پر

یقین رکھتے ہیں جنہیں وہابیوں نے مسترد کر دیا تھا“ ص ۱۹۲۔ اللہ رے سخن فہمی !!

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

خدا فرما چکا قرآن کے اندر
مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر
نہیں میرے سوا طاقت کسی میں
کہ کام آوے تمہاری بے کسی میں
جو خود محتاج ہووے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا الزم

(نہ) صادق پور کے بڑے مکان میں جو قافلہ کے نام سے مشہور تھا۔
جہاد کے رضا کار بنگال سے آتے ہوئے کچھ دنوں قیام کرتے اور وہاں ناظم
جماعت کے مواعظ سے مستفید ہوتے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ یہ واعظ
مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) اور سان کی عدم موجودگی میں ان کے
چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۷ھ) ہوتے۔ اور موخر الذکر
کے انتقال کے بعد مولانا یحییٰ علی (ف دراندان ۱۲۸۶ھ) یہ خدمت
انجام دیتے۔ یہ سلسلہ باضابطہ ۱۲۶۹ھ تک جاری رہا، جب کہ سازش کا
پہلا مقدمہ شروع ہوا۔ صادق پور کا قافلہ "والا مکان" (جہاں اس وقت
پٹنہ سٹی میونسپلٹی کی عمارت ہے) بہت وسیع تھا۔ اور وہاں بیک وقت
سیکڑوں آدمی مقیم ہوتے۔ قافلہ کے مواعظ کے علاوہ نمونہ کی جامع مسجد

۱۷ پٹنہ کا ایک محلہ قدیم شہر عظیم آباد (موجودہ پٹنہ سٹی) اور موجودہ باتلی پور کے درمیان۔ آج بھی یہ
مسجد آباد ہے۔ کوئی سو سو برس سے یہ مسجد اہل صادق پور کے نظم و اہتمام میں ہے اور اس پوری مدت
میں چار پانچ سے زیادہ امام نہیں ہوئے۔ آج کل مولانا حکیم عبدالغنی صاحب صادق پوری
(خلف مولانا حکیم عبدالغنی صاحب و نبیرہ مولانا احمد اللہ صاحب) مسلسل پچیس تیس سال سے
خطبہ امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

میں شاہ محمد حسین صاحب (جنہوں نے خود اپنے صرف سے اس مسجد کی توسیع کی تھی) کا ہر ہفتہ نماز جمعہ کے بعد وعظ ہوتا۔ ان کے مرید اطراف و اکناف سے آکر جمع ہوتے۔ زمانہ مکان میں آپ کا الگ وعظ ہوتا۔ "مقدمات سازش" کی کارروائیوں میں نمونہ یہ کی مسجد کا ذکر کثرت سے آتا ہے۔ اور اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہتھیارے رضا کار "انفیس مواعظ کی حرارت سے اپنے دلوں کی انگلیٹھیاں گرم کرتے۔

یہ نظم جماعت کا مختصر خاکہ تھا۔ جو صحیح ترین معلومات کی بنیاد پر عرض کر دیا گیا۔ غیروں کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت تھی؟ اس کا بھی مختصر بیان ملاحظہ کر لیجئے۔ گو ان کے بیانات مبالغے سے خالی نہیں۔

"سر ہربرٹ اڈوارڈس (Sir Herbert Edwards) جنہوں

نے پہلے مقدمہ سازش (انبالہ۔ ۱۸۹۴ء) کی سماعت کی تھی۔ ان "خطرناک لوگوں" کے متعلق فرماتے ہیں :-

"نداری اور بغاوت کے ایک مرکزی دفتر کا وجود پٹنہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ مولوی امتیاز، علم اور اپنے شہر میں اہمیت کے مالک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس خاندان کے مختلف ارکان کے متعدد وسیع مکانات، بزرگوں کے مقبرے اور طالب علموں اور

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

مریدوں کی ضیافت کے لئے ایک قافلہ "ہے۔"

اسی طرح پٹنہ سشن کورٹ کے جج مسٹر (W. Ainolie)

جنھوں نے دوسرے مقدمہ سازش (پٹنہ = ۱۸۶۵ء) کی سماعت کی تھی، فرماتے ہیں۔

"اس طرح پر یہ ثابت ہے کہ یہ لوگ مشرقی بنگال میں جہاد کی تبلیغ کرتے اور آدمی اور رُپے اس کے لئے جمع کرتے تھے۔ وصول شدہ رقم پٹنہ جاتی اور اشخاص پٹنہ ہو کر گزرتے۔ یہاں وہ عبدالرحیم (مولانا عبدالرحیم متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء) کے گھر ٹھہرتے، اور مولوی بھٹی علی [متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء] انھیں بغاوت کی تلقین کرتے۔ عبدالغفور [متہم سازش انبالہ] انھیں رُپے فراہم کرتا تھا۔ تھانیس میں محمد حنیف [متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء] اُن کا استقبال کرتا تھا اور آگے سفر کے لئے زاد راہ فراہم کرتا۔ یہ سٹھانہ جاتے اور وہاں باغیوں کے ساتھ شریک ہو جاتے، جو وہاں کافی تعداد میں تھے۔ ان کا سرغنہ احمد اللہ [مولانا احمد اللہ متہم سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء] تھا۔ الخ (کلکتہ گزٹ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء)۔"

یہ آخری فقرہ قصداً بڑھایا گیا ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا بھٹی علی

رحمۃ اللہ علیہ (ف ۱۸۶۴ء) اور مولانا عبدالرحیم (ف ۱۸۶۳ء) کی

ٹیلر (Taylor) کی کتاب ہندستان میں اڑتیس سال (Thirty-eight

Years in India) جلد ۲ ص ۵-۸ مطبوعہ لندن ۱۸۶۲ء

گرفتاری تک (۱۲۸۶ھ) مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ) اس کا روبرو بار سے بالکل الگ رہے۔ گرفتاریوں کے بعد انھوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس تحریک کے اصلی کارکنوں کی سیرت اور کام کے متعلق ان کے سب سے بڑے دشمن کی شہادت قابل غور ہے:-

”امام نے ۱۲۸۶ھ میں پٹنہ کے خلفاء کا انتخاب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا، جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور انتہائی مستقل مزاج تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ متعدد بار جب یہ تحریک دم توڑتی نظر آتی تھی، کس طرح انھوں نے از سر نو جہاد کا جھنڈا بلند کیا اور تحریک کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ پٹنہ کے خلفاء، جو ان تھک مبلغ، اپنی ذات سے بے فکر اور بے داغ زندگی بسر کرنے والے تھے، انگریز کافروں کی حکومت کے اکھاڑ پھینکنے میں ہمہ تن مصروف اور روپیہ اور رنکروٹ کی فراہمی کے لئے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت ہی ہوشیار تھے۔ اصل میں یہ اپنی جماعت کے لئے نمونہ اور مثال تھے۔ ان کی تعلیمات کا بڑا حصہ بے عیب تھا اور یہ انھیں کام تھا کہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی ایک ایک بڑی تعداد کو پاک زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی۔“

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

بنگال کے دیہاتوں میں مجاہدین کی تنظیم خاص طور پر قابل رشک تھی۔ اس سلسلے ہنٹر صاحب کی شہادت ملاحظہ ہو:-

”بے شمار باغیانہ لٹریچر، پٹنہ کا مرکزی دارالاشاعت اور بنگال کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مبلغین کے علاوہ، باغیانہ رجحان رکھنے والے عوام تک پہنچنے کے لئے ان لوگوں نے ایک چوکھی راہ بھی بنگال رکھی تھی۔ ابتدا ہی میں خلفائے اس بات کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ جہاں کہیں بھی ان کے مرید ہاتھ بٹائیں، مبلغین کو چاہئے کہ وہاں اپنی مستقل نوآبادی قائم کر لیں۔ اس طرح بنگال کے دیہاتی علاقوں میں متعدد باغیانہ نوآبادیاں قائم ہو گئیں۔ بغاوت کے یہ ضلع دار مرکز پٹنہ کے مرکز سے باقاعدہ خط و کتابت رکھتے تھے۔ ہر مرکز روپیہ اور آدمیوں کی فراہمی کا مکمل نظام رکھتا۔“

”مگروہانی اپنی طاقت و اثر کے لئے کسی ایک طبقے کے دست نگر نہیں خواہ وہ کتنا ہی مالدار اور طاقتور کیوں نہ ہو، وہ نہایت دلیری کے ساتھ عوام کو خطاب کرتے ہیں۔ ان کا مذہبی یا سیاسی نظام ایک انقلاب پسند آبادی کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور پھر بڑی خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ان میں ہزاروں ایسے مخلص اور متقی آدمی ہیں، جو نفس کشی اور

اور قربانی کو زندگی کا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں جماعت کی برتری کا باعث ہیں۔ بہترین وہابی وہ ہے، جو نہ کسی سے ڈرے اور نہ کسی پر رحم کھائے [۹] اس کی زندگی کی شاہ راہ بالکل صاف ہے کسی قسم کا تشدد یا تنبیہ اسے اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔

اس قسم کے ایک ممتاز کارکن کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :-

”مالدہ کا انچارج امیر الدین عبدالرحمن دیہاتوں میں تحریک کی تبلیغ کرتا رہا۔ اور رضا کاروں کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں بھی مجاہدین کی امداد کے لئے سرحدی علاقوں میں جاتی رہیں۔ اس طرح بنگال کے تمام علاقوں میں چندہ اور رضا کاروں کی فراہمی کے لئے شاخیں قائم ہیں۔“

یہ ایک واقعہ ہے کہ ہنٹر کی مبالغہ آمیزیوں نے بنگال میں اس تحریک کو بہت زیادہ پھیلایا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنگال پر جس سفید فام صاحبِ قلم نے کچھ لکھا، وہ اس کا بوسے سے متاثر رہا۔ مردم شماری کی رپورٹیں بھی اس ”روگ“ سے خالی نہیں۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء کی رپورٹوں کے مقدمہ نگار نے وہابی تحریک پر اچھی خاصی بحث کی ہے اور اس کی فراہم کردہ معلومات تقریباً سب کی سب راویاں، اوکنلے اور ہنٹر (ماہرین وہابیات) کے بیانات سے ماخوذ ہیں۔ بہر حال اندازہ کے لئے ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ

سے نظام عمل کے متعلق ایک اقتباس پیش ہے۔

”اس پوری مدت (۱۸۳۱ء-۱۸۶۸ء) میں پٹنہ سازش کا مرکز تھا۔ وہاں مبلغ ہندستان اور دوسرے قریب کے ملکوں میں اپنے مشن کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کے بڑے لیڈر ولایت علی اور عنایت علی پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ولایت علی نے بنگال کا دورہ کیا۔ پھر بمبئی، حیدرآباد اور صوبجات متوسط میں گشت کرتے رہے۔ اور انھیں علاقوں کو اپنی دعوت کا مرکز قرار دیا۔ عنایت علی نے بنگال کے اضلاع مالدرہ، بوگرا، راج شاہی، پبنہ، ندیا اور فریدپور میں اپنی کوششیں صرف کیں۔ ولایت علی کے خلیفہ زین العابدین حیدر آبادی نے چھپرا اور سلہٹ [سام] میں کام کیا۔ معمولی مبلغوں کا کیا ذکر، کہ ان کی تعداد بے شمار تھی۔ اس طرح پرانے مبلغ چپہ چپہ میں پھیل گئے۔ گاہے گاہے پٹنہ سے ہدایات ملتی رہتی تھیں، جس سے تحریک کی عملیت میں فرق نہیں آنے پاتا۔“

ان اقتباسات کا سلسلہ دراز کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایک ہی بات کے بار بار دہرانے میں کوئی خاص فائدہ نہیں نظر آتا۔ اردو میں مولوی طفیل احمد صاحب نے اپنی کتاب (مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں کچھ اقتباسات دیئے ہیں، مگر ان کا ماننا نہ ہنٹر کی رسوائی کے عالم کتاب ہے، اور ہنٹر کا زیادہ تر

بھروسہ سارا ونشا T. E. Ravenshaw اور جمیس اے۔ وکٹلے

(James O'Kinely) پر ہے۔ اور ان دونوں کی تحریروں کے نمونے دیئے جا چکے۔ اسپیرل گزیٹر (بابت ضلع پٹنہ) میں بھی ہنٹر صاحب کی روح کار فرما ہے۔

فرہنگ مصطلحات

اس سلسلے کی ایک اور دلچسپ چیز کا ذکر کرنا ناظرین کی ضیافت طبع کا باعث ہو گا۔ مجاہدین اپنے خط و کتابت میں قسم قسم کی سمجھی بوجھی اصطلاحات خفیہ لغت کے **CODE** کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاکہ کرا ماکا تبین گوشہ نہ ہو۔ مگر ان لالی بھکڑوں نے بھی آخر پتہ لگا ہی لیا۔ مجاہدین کے سب سے بڑے کرم فرما سٹر راوشا نے اپنی یادداشت میں ان اصطلاحی لفظوں کی ایک فرہنگ دی ہے، جسے کچھ تفریح اور کچھ تاریخ کی خدمت کے خیال سے ہم یہاں درج کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ البتہ اتنا ملحوظ رہے کہ ان کا حرف بہ حرف صحیح ہونا یقینی نہیں، کہ یہ لوگ مبالغہ بہت کرتے ہیں:-

جہادی، خدمت گار، بیوپاری { جنگ کے رنگروٹ -

مسافر، ساند -

رنگروٹوں کا جھٹھا

قافلہ

ملکا - ستھانہ

بڑا گودام

یٹنہ

چھوٹا گودام

جنگ

اللہ

ہنڈی

نقدِ رقیب

مقدمہ

مختار

سفید پتھر

کتابوں کی قیمت

قافلہ

صادق پور کے مولویوں کے مکان کا احاطہ

اور خاص کردہ مکان جس میں مولوی ولایت علی اور عبدالرحیم رہا کرتے تھے۔

۱۸۷۱ء کے مقدمہ سازش میں عبدالغفور (متہم و سزا یافتہ مقدمہ

سازش انبالہ ۱۸۷۲ء، جو بعد میں وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا، اور

اس کی سزا جس دوام بعد دریا لے شور سے گھٹا کر دس سال کر دی

گئی تھی) نے بھی اپنی شہادت کے سلسلے میں بعض مصطلحات کا ذکر کیا ہے،

جو اسی کے لفظوں میں درج کئے جاتے ہیں:-

(وکیل صفائی مشر (INGRAM) کے جرح کے جواب میں

”جوتوں (SHOES) سے پلے مراد ہیں۔ اسی طرح کتابوں سے بھی مجھے نہیں

معلوم کہ کسی شہر کا بھی کوئی فرضی نام تھا۔ گلشن اس جگہ کا نام ہے، جہاں

عبداللہ [مولانا عبداللہ، امیر الجہاد] رہتے تھے۔ یحییٰ علی [مولانا یحییٰ علی،

متہم سازش انبالہ] نے مجھ سے بیان کیا کہ بابو صاحب سے مراد عبداللہ ہیں

جوتوں سے آدمی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ موقع کے لحاظ سے کتابوں سے آدمی

اور رپے دونوں مراد ہوتے تھے۔ نوکروں سے مجاہدین بھی مراد ہوتے تھے۔
 راونشا کے نقش قدم پر ایک دوسرے ماہر قانون نے بھی ”فرہنگ مصطلحات“
 میں کچھ قیمتی اضافے کئے ہیں۔ ناقدری ہوگی، اگر ان کی تحقیقات سے
 ناظرین کو محروم نہ کھا جائے۔ یہ صاحب سٹر انسلی (AINSLIE)
 پٹنہ کے سیشن جج ہیں، جنہوں نے مقدمہ سازش، پٹنہ (۱۹۶۵ء) کی
 دوسری سماعت کی تھی (پہلی سماعت خود سٹر راونشا نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
 کی حیثیت سے کی تھی) یہ اپنے ”فیصلے“ کے آغاز ہی میں ترتیب ذیل سے
 ’جعلی‘ اور ’اصلی‘ ناموں کی فہرست دیتا ہے اور اس نے ہر نام کے ساتھ ثبوت
 کے گواہ یا گواہوں کے نام بھی دیئے ہیں، جسے ہم طہالت کے خوف سے
 نظر انداز کرتے ہیں:-

جعلی نام
 محی الدین
 بشیر الدین

اصلی نام
 یحییٰ علی
 فیاض علی

۱۔ مولانا فیاض علی (مولود تقریباً ۱۲۳۵ھ) مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۷ھ) اور مولانا یحییٰ علی
 (ف ۱۲۸۷ھ) کے سگے بھائی تھے، مولانا احمد اللہ سے چھوٹے اور مولانا یحییٰ علی سے بڑے، مولانا ولایت علی
 سے بیعت تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ رہے پھر آخر میں صبرات بٹیری کا اپنا مستقر بنالیا۔ اور وہیں غربت و
 ہجرت کے عالم میں وفات پائی۔ کوشش کے باوجود ٹھیک سنہ وفات نہ معلوم ہو سکا۔ راونشا نے آپ کا
 نام ان گوں کی فہرست میں دیا ہے جو ۱۸۶۵ء میں مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۲ھ) کے ساتھ
 ملکا۔ ستمیانہ کے جہادیوں میں شامل تھے۔

اسلی نام

مولوی عبداللہ

محمد شفیع

عبدالرحیم

محمد جعفر

عبدالقادر

احمد اللہ

محمد احسان

عبدالرحیم کاظم

ملکا - ستھانہ

پٹنہ

جعلی نام

بالو جان - میاں جان

شفاعت علی

رحیم بیگ

پیرو خاں - پیرو خلیفہ

غلام قادر

احمد علی

روح اللہ

قافلہ، قافلہ گاہ

بڑا گودام

چھٹا گودام

۱۵ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا یحییٰ علی کے صاحبزادے کا نام احسان تھا۔ یہ غلط ہے۔ ان کا نام محمد عیسیٰ تھا۔ اور یہی بعد میں شمس العلماء مولانا امجد علی ام، اے کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان پر وارنٹ تھا، اس لئے نام بدل لیا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ کہ ان کے کوئی صاحبزادے ابھیلا میں شہید ہوئے۔

چھٹا باب

سازش کا الزام اور مقصد

یہ پہلے کہیں گزر چکا ہے، کہ کمپنی کی حکومت نے پہلے پہل ”مجاہدین“ کے آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں کی۔ ہنٹر ایک جگہ لکھتا ہے کہ بعض کارخانوں کے مسلمان ملازم اپنے انگریز مالکوں سے جھڑپوں لے کر جہاد کو جایا کرتے تھے۔ یہ سرسیدؒ نے ایک اور دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے:-

”دہلی کے ایک ہندو مہاجن نے جس کے پاس ”جہاد یوں“ کی امدادی رقمیں جمع تھیں، کچھ غبن کیا۔ تو مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نے مسٹر ولیم فریئر (W Fraser) کمشنر دہلی کے اجلاس میں نالش کی اور مدعی کے حق میں

۱۔ ہنٹر کی کتاب (ہندستانی مسلمان) کا جواب از سرسیدؒ (۲۲-۲۳) Sir Sayed

Ahmad on Dr. Hunter's
'Our Indian Musalmans'
(مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء)

۲۵ انڈین مسلمانز:- ص ۱۷۱

ڈگری ہوئی۔ وصول شدہ رقم پھر دوسرے ذریعہ سے سرحد کو بھیجی گئی۔ اس مقدمے کا اپیل صدر کورٹ الہ آباد میں ہوا۔ وہاں بھی عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رہا۔

شاہ محمد اسحاق صاحب ^{۱۲۵۶ھ} _{۱۸۴۲ء} میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، اس لئے یہ واقعہ قطعی طور پر ^{۱۸۴۲ء} _{۱۸۴۲ء} سے پہلے کا ہے۔ کہنا یہ ہے اور صاف صاف کہ جب تک "مجاہدین" سکھوں سے اُلجھے رہے، کمپنی کی حکومت خلیش اور غیر جانبدار رہی۔ "سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" پُر ترکوں نے نجد میں عمل کیا تھا۔ ان کے استادوں نے اس فارمولے پر یہاں عمل کیا۔ مقصود یہ تھا کہ مجاہدین اور سکھوں کی آویزش میں سرکار عالی کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہو رہے گا۔ لیکن جو نہی پنجاب کا الحاق عمل میں آیا۔

(^{۱۲۶۵ھ} _{۱۸۴۹ء}) کمپنی اور سرکار کی نظر میں مجاہدین سے بُرا کوئی نہیں تھا۔ پھر

۱۵ میلانا شاہ محمد اسحاق صاحب، شاہ عبد العزیز کے نواسے تھے۔ ^{۱۲۵۶ھ} _{۱۸۴۲ء} میں مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔ اور وہیں ^{۱۲۶۲ھ} _{۱۸۴۶ء} میں وفات پائی۔

۱۶ برطانوی ہند کے مشہور تاج داں ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، اپنے ایک خطبے میں (جو انہوں نے جون ۱۹۳۹ء میں ہمارا جرنلیت سنگھ کی صد سالہ برسی کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا) کہتے ہیں، کہ سرکار کمپنی کی یہ محتاط اور غیر جانبدارانہ روش "اصولی طور پر بالکل درست تھی (روزنامہ لیڈر) الہ آباد: مورخہ ۳۰ جون ۱۹۳۹ء

۳۵ ملاحظہ ہو: اس کتاب کا پہلا باب۔

کوئی کسر نہیں تھی، جو ان کے کچلنے کے لئے اٹھار کھی گئی ہو۔ اس سلسلے میں حکومت نے جو تعزیری کارروائیاں کیں، ان میں مقدمات سازش کا نام سرعنوان آتا ہے۔ یہ مقدمے ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک ملک کے مختلف حصوں میں دائر کئے گئے۔ زیر نظر سطروں میں ان ہی مقدمات کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلا مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۸ء

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے اپنا کام "اس طرح انجام دیتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ مگر ۱۸۵۸ء کی فوجی مہم نے اس راز کا انکشاف کیا کہ سرحدی مقتولوں میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد ہے، جو رنگ روپ میں پورب (بنگال بہار) کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ شہداء کی لاشوں کے علاوہ گھر کے بعض اہل عناد نے بھی خیر سانی کی اور اسرارِ برہمہ کے انکشاف میں حصہ لیا۔ نیز شہر کے بعض رئیسوں نے بھی خیر خواہی کا حق ادا کیا۔ خاقانی ہند حکیم عبد الحمید عظیم آبادی (۱۲۴۵-۱۳۲۳ھ) خلف مولانا احمد اللہ نے اپنی شہنوی شہر آشوب میں گھر کے بھیدیوں کا ڈر ڈر کر ذکر کیا ہے۔ اس کے دو شعر عرض ہیں۔

متفق گشتہ جمعے از حساد
دل شان پر ز بغی و شر و فساد
فرقہ طامعان اہل عنرض
زاد ہا اللہ فی القلوب مرض الخ

۱۸۶۳ء کی مہم اہلیا کے بعد سرکار برطانیہ کو اور کدھوئی - گو
اس سے پہلے بھی، بلکہ الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے بعد ہی سے حکومت
کی نگاہ ان لوگوں پر تھی۔ مگر اس "سازش" کا حقیقی انکشاف ایک ولایتی
افغان غزن خاں نامی نے کیا۔ راونشا صاحب فرماتے :-

"مئی ۱۸۶۳ء کو چار بنگالی انبالہ جاتے ہوئے ضلع کرناٹ میں ایک
سوار پولیس سرجنٹ غزن کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ غزن خاں یوسف
زئی علاقے کا باشندہ ہے۔ اس نے چاروں بنگالیوں کو شکل و شباهت
میں ان لوگوں کے مشابہ پایا، جو برطانوی فوج کے ہاتھوں ستھانہ والی
لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ بنگالی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے
گئے۔ لیکن بعد میں رہا کر دیئے گئے۔ غزن خاں نے اپنے بیٹے کو ملکا بھیجا
اور یہ دریافت کرایا کہ مولوی جعفر تھا نیسری کے ذریعہ اشخاص اور اسلحہ
سے "پہاڑ" کے جہادیوں کی مدد کی جاتی ہے۔ یہ اطلاع انبالہ کے ضلع ریٹرنڈ
پولیس کنیٹن پارسن (Q. D. Parson) کو دی گئی، جنہوں نے
تفتیش شروع کی۔ الخ

راونشا نے ۱۸۵۲ء (۱۲۶۷ھ) میں راولپنڈی کے ایک دستے 4th Regiment

of Native Infantry کے اندر جہادی ساز باز کا ذکر کیا ہے۔ نیز اسی کے بیان کے

مطابق اس رجمنٹ کے منشی محمد ولی پر مقدمہ چلایا گیا اور وہ سزا یافتہ ہوا (۱۲ مئی ۱۸۵۳ء شعبان ۱۲۷۰ھ)

۲۷ کلکتہ گزٹ: ۲۰ ستمبر ۱۸۶۱ء۔ بہتر نے بھی اسی کے بیان پر اعتماد کیا ہے۔

یہ روایت اور اس مقدمے کی اکثر تفصیلات اور نشاۃ اور ہنٹر نے تقریباً ٹھیک ٹھیک بیان کی ہیں۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے اپنی کتاب تواریخ عجیب میں اس مقدمے کی پوری روداد قلم بند کر دی ہے، جو اپنے بیان کی سادگی اور پرکاری کے لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں سازش کے انکشاف سے متعلق مولوی محمد جعفر صاحب کی تحریر بھی ملاحظہ کر لی جائے، تاکہ سرکاری "ماہرین فن" اور ایک مبتلائے محن کے بیانات کا مقابلہ کر کے "بین السطور" مفہوم اخذ کیا جاسکے:-

"ایسے نازک وقت اور گھما گھمی کے ایام میں [یعنی ابیدلا کی مہم میں سرکاری فوج کی تباہی کے دنوں میں] ۱۱ اوردسمبر ۱۸۶۳ء مطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ ہجری کو ایک سوار پولیس متعینہ چو کی پانی پت ضلع کرنال مسمیٰ غزن خاں نام ایک ولایتی افغان نے کسی ذریعہ سے میرے حال سے واقف ہو کر اور ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقعہ جان کر ایک بڑی لمبی چوڑی کیفیت خیر خواہانہ [۱] کے ساتھ بجنور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہو کر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی "قافلہ" [قافم] والوں کے ساتھ سرحد پر پہور ہا ہے [کذا] ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسری روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے۔ خیر، ڈپٹی کمشنر کرنال نے یہ داستان سن کر بذریعہ تاری برقی ضلع انبالہ کو کہ جس کی حدود اراضی کے اندر ہمارا شہر واقع ہے خیر بھیج دی" (ص ۳۱)

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

جب داستان چھڑ گئی ہے۔ تو اس روداد الم کا ایک دلچسپ باب اور ملاحظہ کر لیجئے:-

”ادھر مخبر مخبری کر کے نکلا تھا کہ ادھر ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر صاحب کرتال کی ملاقات کو ان کے بنگلے پہنچے۔ جن سے عند التذکرہ صاحب موصوف نے ذکر اس مخبری کا بھی کیا۔ جب بعد الفراغ ملاقات یہ صاحب اپنے ڈیرے کو تشریف لائے۔ تو انھوں نے مسمی کا وانا نام ایک اپنے نوکر سے جو میرا ہمسایہ تھا، بطور افسوس حال اس مخبری کا بیان کیا۔ کا وانا مذکور یہ حال سن کر اسی وقت اس کی خبر کرنے کو تھا نیسردوڑ پڑا۔ لیکن خوبی تقدیر سے کچھ زیادہ رات گئے، یہ شخص تھا نیسر میں پہنچا اور سب سے پہلے میرے مکان پر آیا۔ مگر میں اس وقت گھر کے اندر سو رہا تھا۔ وہ اس وقت رات کو ہمارا دروازہ بند اور ہم کو سوتے دیکھ کر ایسے آرام کے وقت ہم کو ”تکلیف دینا مناسب نہ جان کر اپنے دل میں سوچا کہ فجر کو خبر کر دوں گا۔ ادھر تقدیر اس کو تو دروازے پر سے ہٹالے گئی۔ اب ادھر انبالہ کی کیفیت سنئے۔ جب انبالہ میں یہ تاریخ پہنچی تو ایک وارنٹ میری خانہ تلاشی کا جاری ہوا۔ اور کپتان پارسن صاحب ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک جماعت کثیر پولیس کی لے کر راتوں رات میرے مکان پہنچے۔“ (ص ۳-۴)

پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیلی سرگزشت تو ایخ عجیب سے معلوم ہو گی

لہ پارسن نے اپنی شہادت میں خانہ تلاشی کی تاریخ ۱۲ دسمبر ۱۸۵۷ء بتائی ہے۔ (وہابی ٹرائل: ص ۲۵)

ہنٹرنے بھی اپنی کتاب میں اس مقدمے کی تفصیلات دی ہیں۔ اس لئے ہم یہاں دوران مقدمہ کی تفصیلی کارروائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ضروری باتیں ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:-

اس مقدمہ میں کل گیارہ ملزم تھے جن کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) مولانا یحییٰ علی جعفری صادق پوری۔ عمر ۴۲ سال۔

راولپنڈی کے ان کا عہدہ امیر الہ اعظمین بتایا ہے۔ اصل میں یہ نظم جماعت کے ذمہ دار تھے۔ انھیں "سرغنہ" کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے اور بجاطور پر۔

(۲) مولانا عبد الرحیم صادق پوری۔ عمر ۲۸ سال۔ تقویٰ سولہ سال

جزائر انڈمان میں رہ کر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۱ء میں رہا ہوئے اور بڑی عمر پا کر ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

(۳) منشی محمد جعفر تھانیسری۔ عمر ۲۸ سال، ساکن تھانیسری ضلع انبالہ۔

تمام اسیران بلامیں یہ سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ پورے مقدمے کے دوران میں انھوں نے کوئی وکیل نہیں مقرر کیا۔ اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر حرج کی۔ مولوی عبد الرحیم صاحب کے ساتھ یہ بھی رہا ہوئے۔ اور ایک عرصہ آزاد رہ کر ۱۹۰۵ء میں رحلت کی۔

۱۹۰۵ء گرفتاری قیادتوں کی ہوئی۔ مگر ملزم صرف گیارہ آدمی قرار دئے گئے۔ کچھ لے دیے کر

چھوڑ دیئے گئے۔ اور بعضوں نے سرکاری گواہ بن کر دستکاری حاصل کی۔

سید صاحبؒ کی قائم کی ہوئی جماعت میں یہی ایک ذمہ دار آدمی ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۵۷ عہ کے ہنگامے میں شرکت کی تھی۔

(۴) میاں عبدالغفار۔ ساکن (پٹنہ) راونشانے ان کا نام عبدالغفور

ولد منگو قوم کوٹری عمر ۲۵ سال۔ ملازم ملزم ہے [یعنی مولانا عبدالرحیم] لکھا ہے۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ رؤساء صادق پور اس "ملازم" کا "آقا" سے بڑھ کر احترام کرتے تھے۔ یہ بزرگ امی اور مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۲۶۹ھ)

کے خادم تھے۔ مولانا فرحت حسینؒ (ف ۱۲۷۴ھ) اور مولانا یحییٰ علیؒ

(ف ۱۲۸۴ھ) سے تربیت حاصل کی۔ مولوی عبدالرحیم صاحبؒ کے ساتھ اندامان سے واپس ہوئے۔ کوئی تیس برس ہوئے کہ ان کا انتقال ہو گیا

خود مولانا عبدالرحیم اور تمام متاخرین علمائے صادق پور انھیں سیدی میاں عبدالغفارؒ کہا کرتے۔ صحیح تاریخ وفات نہ معلوم ہو سکی (ف تقریباً ۱۳۳۳ھ)

(۵) قاضی میاں جان، ساکن کمر کلی (Commercolly) ضلع ٹیٹہ

(بنگال) عمر ۶۰ سال انبالہ جیل ہی میں وفات پائی۔ انبالہ کے جج کے بیان کے مطابق مراسلات کا سب سے زیادہ باغیانہ حصہ انھیں کے گھر پر

پایا گیا۔ شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ متعدد ناموں سے مشہور تھے۔ ان کے بھائی قاضی مراد علیؒ نے ان کے خلاف شہادت دی۔ اسی کے

سہ یہ بھی ہنٹر کا بیان ہے اور دوسرے ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی تھی۔ اور قاضی مراد کو شہادت کے معاوضے میں انعام بھی ملا تھا۔

یہ پانچ بزرگ تمام ابتلا و آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اپنی ثابت قدمی سے عہدِ صحابہ کی یاد تازہ کر دی۔ (اسیرانِ ابتلا کے الام و مصائب کا ذکر آخر میں آئے گا)

(۶) محمد شفیع انبالوی۔ یہ پیشے کے اعتبار سے قصاب تھا اور فوجی چھاؤنیوں میں گوشت سپلائی کیا کرتا تھا۔ اور لاکھوں روپے کے کاروبار کا مالک تھا۔

اس کا مرکز راولپنڈی تھا، اور مختلف چھاؤنیوں میں اس کے گماشتے مقرر تھے۔ اور ستھانہ کی جہادی چھاؤنی کو رپے زیادہ تر اسی کے ذریعے جلتے تھے۔

اسی لئے پہلے پہل مولانا یحییٰ علی اور منشی محمد جعفر صاحب کے ساتھ اسے بھی پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ بعد میں ان تینوں کی سزا بھی پنجاب جوڈیشل کمشنر نے جس دوامِ عبور و دریاے شہر سے بدل دی (۲۴ اگست ۱۹۴۷ء)

۱۵ وہابی ٹرائل: ۱۹۴۵ء ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اس کا خاندان دارن مہینگر (۱۹۴۵-۱۹۴۸ء) کے زمانے میں گورنمنٹ چھاؤنیوں کی ٹھیکہ دار کی بنا تھا۔ غلام علی بھٹی رائل ایشیائیک سوسائٹی جلد ۱۲ ص ۳۷ (۱۹۴۷ء) ۱۵ اسیرانِ بلا کے کرم فرمائے حضور صی خاں منٹو (علیہ ما علیہ) نے سزا کی تبدیلی کی عجیب و غریب توجہ کی ہے۔ ان کا ایمان بہت قوی تھا۔ اور وہ پھانسی کی سزائوں کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اسی لئے برطانوی حکام نے ان سے یہ بجا انتقام لیا کہ ان کے بڑے سے بڑے باغی کو بھی درجہ (باقی صفحہ ۱۴۴)

لیکن اول دن ہی سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بعد میں دوسروں کے ساتھ یہ بھی وعدہ معاف گواہ بن گیا تھا۔ ۱۸۶۵ء کے مقدمہ سازش، پٹنہ اور ۱۸۷۱ء کے آخری مقدمہ سازش (پٹنہ) میں اس نے سرکاری گواہ کی حیثیت سے شہادت دی۔ کل دو برس یہ قید رہا۔ لیکن سرکار نے اس کی جائداد ضبط ہی کر لی اور واپس نہ کی۔ مولوی محمد جعفر صاحب کا بیان ہے کہ اس کی جائداد پچاس لاکھ کی مالیت کی بیوگی۔ ہنٹر نے اس کی بہت بُرائی کی ہے اور جی بھر کر گالیاں دی ہیں۔ یہاں تک کہ سود خواروں کا الزام بھی عائد کیا ہے، جو بالکل ناروا ہے۔ اور گو محمد شفیع نے ایک مخلص مسلمان کی حیثیت سے اعلیٰ کردار کا ثبوت نہیں دیا، پھر بھی حق و انصاف کی خاطر ہنٹر کے اس ناروا اتہام کی تردید ضروری معلوم ہوئی۔

(۷) عبدالکریم انبالوی۔ عمر ۳۵ سال۔ یہ محمد شفیع کا مختار تھا، بعد میں اس کا بھانجی داماد بھی بن گیا تھا۔ محمد شفیع کی طرح اس کے قدم میں بھی شروع ہی سے لغزش تھی۔ اور یہ بھی بعد میں سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ یہ صرف ڈیڑھ دو سال قید میں رہا۔

(بقیہ حاشیہ منسلک) شہادت موصول کرنے کا موقع نہیں دیا۔ (۹۵)

سبحان اللہ! یہ ظالم! جہاد و جلال وطنی، قید و مشقت اور سرگردانی و شوق شہادت کی

لذت اور اجر کا حال کیا جانے؟

۱۵ تاریخ عجیب: ۹۴۷

(۸) عبد الغفور ولد شاہ علی خاں ساکن ضلع شاہ آباد۔ بہار [ہزاری
باغ بہار۔ حسب روایت مولوی عبدالرحیم صاحب] عمر ۲۵ سال۔ یہ تھا نیسر
 میں مولوی محمد جعفر صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ اصل میں یہ الہی بخش (ملزم ملا) کا
 ملازم تھا۔ پہلے عبور دریاے شور کی سزا ہوئی۔ پھر دس سال رہ گئی مقدمہ
 سازش پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں یہ بھی سرکاری گواہ تھا۔ ہنٹرا سے عبد الغفار
 کہتا ہے، جو صحیح نہیں۔

(۹) حسینی ولد محمد بخش۔ عمر ۲۵ سال، تھا نیسر۔ یہ مولانا عنایت علی
 کی زندگی میں شریک جہاد رہ چکا تھا۔ بعد میں جماعت کے کاموں میں مولوی
 محمد جعفر صاحب کا معاون ہو گیا تھا۔ مقدمہ سازش، پٹنہ (۱۸۷۱ء) میں
 سرکاری گواہ کی حیثیت سے اس کی شہادت ہوئی تھی۔ کل سات برس
 قید رہا۔

(۱۰) حسینی ولد میکھو ساکن پٹنہ۔ عمر ۳۵ سال۔ یہ الہی بخش، ملزم ملا کا
 ملازم تھا۔ یہ دس برس قید رہا۔ ۱۸۷۱ء کے مشہور مقدمے میں اس کی بھی
 شہادت ہوئی تھی۔

(۱۱) الہی بخش ولد کریم بخش عمر ۲۴ سال۔ یہ مولانا احمد اللہ صادق
پوری (متہم مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۷۱ء) کا فخر تھا۔ اور اس سال زرکا
 زیادہ تر کام اسی کے واسطے سے ہوتا تھا۔ اس کا خود اپنا کاروبار بھی اچھا
 فاصلہ تھا۔ جس دوام عبور دریاے شور کی سزا ہوئی تھی۔ پھر دس برس

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

مقدمے (۱۸۶۵ء) میں سرکاری گواہ کی حیثیت سے اس کی شہادت ہوئی۔ اور معاف کر دیا گیا۔

ان اسیرانِ بلا میں صرف مقدم الذکر پانچ حضرات اخیر تک ثابت قدم رہے۔ جن میں سے ایک (قاضی میاں جان) نے سزایابی کے بعد انبالہ جیل ہی میں وفات پائی (۱۲۸۵ھ)۔ اور وہ جوان سب میں ممتاز اور باخدا تھا، دو برس اندمان میں رہ کر سفر آخرت کی راہ لی (۱۲۸۶ھ) میری مراد جناب مولانا یحییٰ علی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، جو اپنے تقویٰ اور اخلاص و جہاد کے لحاظ سے ائمہ سلف کا نمونہ تھے۔ باقی تین بزرگ زیادہ سخت جان نکلے۔ سیدی میاں عبد الغفار، مولانا عبد الرحیم (ف ۱۳۲۱ھ) اور نشتی محمد جعفر صاحب تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء)۔ ۱۸۸۳ء میں انڈیا سے رہا ہو کر وطن واپس آئے اور یہی وہ بزرگ ہیں، جن کی زبانی داستانِ اُڑتی ہوئی کچھ ہم نا آشنا یاں راہ و رسم منزل تک پہنچی ہے۔ اس ابتلا و آزمائش کی داستان کا خلاصہ اسیرانِ بلا کے مصائب کے ضمن میں عرض کیا جائے گا۔

ان تمام اسیرانِ بلا میں مولانا یحییٰ علیؒ حیرت انگیز سے ممتاز اور غیر معمولی

سلہ ہنسنے ایک جگہ لکھا ہے کہ [مولانا] یحییٰ علی کے مریدوں میں سے کسی نے ان کے خلاف شہادت

نہیں دی یہ صحیح ہے لیکن امیر خاں کے مقدمے (پٹنہ: ۱۸۸۵ء) میں بہتوں نے شہادتیں دیں، خواہ

جس طرح بھی انھیں دبا دھمکا کر تیار کیا گیا ہو۔ ۱۸۸۵ء کے مقدمے کے متعدد گواہوں نے

عدالت میں یہ بیان کیا کہ انھیں فلاں... صاحب نے شہادت پر آمادہ کیا۔

شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے مختلف کمالات اور خصوصیات کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ سر دست انبالہ کے سیشن جج سر ہربرٹ ایڈورڈس (Sir Herbert Edwards) کے ریسارکس یا تاثرات کا پیش کر دینا کافی ہوگا۔ ہنٹر کی زبان میں شاید ہی کسی عدالت نے کسی ملزم کے متعلق ایسے موثر الفاظ کہے ہوں "سر ہربرٹ سزائے موت کا حکم سناتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”یہ امر یا یہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ بچی علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے، جس کا انکشاف اس مقدمہ کے دوران میں ہوا۔ وہ ایک مذہبی و عظیم تھا، اور انتہائی مقدس قاعدے کے مطابق، پٹنہ کی مسجد سے اسلام کے قابل نفرت اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ جہاد کی تبلیغ اور روسپیوں کی فراہمی کے لئے، اس نے ماتحت ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے اپنی سازشوں سے برطانیہ ہند کو ایک ایسی سرحدی جنگ میں ڈھکیل دیا، جس میں سیکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ وہ مشہور عالم ہیں۔ ان کے متعلق لاعلمی کا عذر نہیں پیش کیا جاسکتا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر اور عزم راسخ کے ساتھ باغیانہ طریقے پر کیا۔ ان کا تعلق ایک موروثی باغی اور جہادی خاندان ہے۔“

He belongs to a hereditary disloyal
and fanatical family

مجاہدین کے کرم فرمائے خصوصی ہنٹر صاحب، مولانا یحییٰ علی اور شتی محمد جعفر صاحب تھا نیسری کی سزایابی پر اس طرح اظہار ہمدردی فرماتے ہیں:-
 ”جعفر، عرضی نوں اور یحییٰ علی واعظ نے وفاداری کا کبھی دعوے نہیں کیا اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کی۔ وہ بڑے فطرتاً اور با اصول آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا، جسے ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ انھوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی۔ تائیں ان کے اس انجام کو درد مندانہ جذبات کے ساتھ یاد کر لے گی۔“

ہنٹر نے محمد شفیع کے علاوہ تمام ماخوذین کے کردار و اخلاق کی تعریف کی ہے۔ لغزش اور معافی طلب کرنے کے باوجود محمد شفیع، ہنٹر کے الزامات کا مستحق نہیں۔ اس مقدمہ سازش اور گرفتارانِ بلا کے متعلق ہنٹر کے خیالات کا اندازہ مندرجہ ذیل بیان سے ہو گا:-

”اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو، جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے، یہ ہیں:- (۱) حیرت انگیز قابلیت، جس سے دور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا گیا۔ (۲) رازداری، جس سے اس کی مختلف پیچیدہ کارروائیاں عمل میں لائی گئیں۔“

(۳) خیر خواہی کا وہ زبردست جذبہ جس نے اس جماعت کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے دلچسپ فرضی ناموں اور خفیہ زبان میں تھا لیکن میں اس لہجہ کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد شفیع، فوجی ٹھیکہ دار کے سوا یہ سب سازشی اپنا کام انتہائی خلوص اور فطرتی جوش کے ساتھ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض سمجھ کر کرتے اور اس عزم کے ساتھ کہ مرتے دم تک اس فرض کو انجام دیئے جائیں گے۔

دوسرا مقدمہ سازش ^ط پینہ ۱۸۶۵ء انتہالہ کے مقدمے کے بعد حکومت اور اس کے ہوا خواہوں کو

اس جماعت سے اور کہ ہو گئی، اور یاروں نے باقی ماندہ ممتاز اشخاص سے انتقام لینے کی فکر شروع کر دی۔ ان انتقامی کارروائیوں کا پہلا شکار سید صاحبؒ کے خلیفہ مولانا احمد اللہ صادق پوری (مولود ۱۲۲۳ھ) کو بنایا گیا۔ مولانا احمد اللہ خلف مولوی الی بخش صاحب جعفری (ف ۱۲۷۵ھ) اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ اس لئے عظیم آباد کے ممتاز رئیسوں میں ان کا شمار تھا اور سرکاری حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ان کی عزت و وقعت کا یہ عالم تھا کہ جب ۱۸۵۷ء میں مشرولیم ٹیلر، کمشنر

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

پٹنہ نے احتیاطی تدبیر کے طور پر انھیں بے قصور گرفتار کر کے حراست میں رکھا، تو وہ معطل کر دیا گیا۔ لیکن یہ ٹیلر پٹنہ ہی میں وکالت کرنے لگا اور موقع کی تاک میں لگا رہا۔ جب انبالہ مقدمہ شروع ہوا، تو پھر حریفوں کی بن آئی اور ٹیلر نے آسمان زمین ایک کر دیا۔ اور حکومت نے مولانا احمد اللہ کو گرفتار کر کے ان پر الگ مقدمہ چلایا (۱۸۶۵ء)

یہ مقدمہ پہلے مسٹر منرو (Munro) آفیشینگ مجسٹریٹ کے اجلاس میں پیش ہوا۔ پھر مسٹر اینسلی (Ainslie) سشن جج کے اجلاس میں سماعت ہوئی۔ دونوں اجلاسوں میں سزائے موت کا حکم ہوا۔ پھر کلکتہ ہائی کورٹ

W. Taylor کی کتاب
Thirty-eight Years in India
جلد ۲ ص ۲۲۴-۲۲۳

مولانا احمد اللہ کے ساتھ ان کے ماموں شاہ محمد حسین صاحب (ف ۱۲۷۶ھ) خلیفہ حضرت سید صاحب اور مولوی واعظ الحق صاحب ساکن گورہٹہ، پٹنہ، بھی ۱۸۵۷ء میں نظر بند کر دیے گئے تھے۔ یہ لوگ تین مہینہ نظربندی کی حالت میں رہے۔ پھر رہا کر دیئے گئے اور ٹیلر معتبوب ہو کر معزول کیا گیا (تذکرہ صادقہ ص ۷۷)

۳۵ مسٹر ولیم ٹیلر کی معزولی کے سلسلے میں مسٹر (Samvels) ریونیو کیشنر پٹنہ ڈویژن اور گورنمنٹ بنگال کے درمیان جو مراسلت ہوئی تھی، اس کی ایک مطبوعہ کاپی (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۷ء) راقم کی نظر سے گزری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ٹیلر نے بعض مقامی مسلمان رئیسوں [جن کی اولاد اس وقت پٹنہ اور اس کے نواح میں موجود ہے] کی چغل خوری پر مولانا احمد اللہ کو گرفتار کیا تھا (مراسلات مذکورہ ص ۱۸-۱۹)

میں اپیل ہوئی، تو سزاؤں موت جیسے دوام سے بدل گئی۔ انڈیاں بھیجے گئے، اور وہاں بھی سرکار کی خاص نوازش قائم رہی۔ اسی غربت اور جلاوطنی کے عالم میں تقریباً سولہ برس زندگی گزار کر ۶۰ سال کی عمر میں جان جان آفریں کے سپرد کی (ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ)۔

یہ دوسرا مقدمہ سازش بعض حیثیتوں سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ (الف) انبالہ والے مقدمے کے "ماخوذین" کا جرم واضح اور ثابت تھا۔ مگر مولانا احمد اللہ کے خلاف کوئی معقول وجہ موجود نہیں تھی۔ ۱۸۶۲ء تک تو وہ ان معاملات سے گویا الگ تھے ہی۔ آخری سال بھر کے واقعات سے متعلق بھی کوئی قابل وثوق شہادت نہیں تھی۔ ان کے "مقدمے" کی ساری کارروائی اور فیصلے راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ پورا مقدمہ بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خود حکام کو اس بات کا اقرار ہے کہ الٹی بخش (ملزم انبالہ) کی شہادت کے بغیر مولانا احمد اللہ کی سزایابی مشکل تھی۔ اور الٹی بخش ۱۸۶۲ء میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کی "مشروط معافی" مولانا کی سزایابی کے بعد ہوئی ہے۔ (۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس مقدمے کے مجسٹریٹ مسٹر راون شا

(T. E. Ravenshaw) پہلے شخص ہیں جنہوں نے باضابطہ

مجاہدین کے "اعمال" اور سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ اور سرکاری نقطہ نگاہ

سے مراسلہ مسٹر (G. F. Cockburn) کمشنر ٹینٹ ڈویژن بنام سکریٹری گورنمنٹ

بنگال۔ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۸۶۹ء۔

سے ایک نہایت قیمتی یادداشت (Memorandum) حکومت کو بھیجی، جس میں بنگال اور بہار کے تمام مبلغوں اور کارکنوں کی ضلع وار فہرست بھی تھی، جس کی وجہ سے یہ غریب مبلغ اور کارکن تقریباً دس سال تک تنگ کئے جاتے رہے۔ اور اسی کی وجہ سے بنگال کے کتنے خوش حال خاندان تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ مشہور بنگالی قانون دان سر عبدالرحیم نے ایک موقع پر یہ حقیقت ان لفظوں میں ظاہر کی تھی:-

”۱۸۷۸ء میں حکومت نے وہابی تحریک کے سبب سے جو محض وہم گمان پر مبنی تھی، بنگال کے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی تمام املاک جو رقبہ میں پورے صوبہ بنگال کی چوتھائی تھی، ضبط کر لی۔ جس سے ہزاروں مسلمان خانماں برباد اور پریشان ہو گئے۔ (خطبہ صدارت مسلم لیگ ۱۹۲۵ء)

ممکن ہے، یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز ہو، پھر بھی صورت حال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ ہنٹر اور اوکنلے اور دوسرے انگریز لکھنے والوں کا ماخذ راونشا کی یہی یادداشت ہے۔

(۳) اسی راونشا نے اپنی یادداشت میں پہلے پہل علمائے صادق پور کی غیر منقولہ جائدادوں کی ضبطی، مکانات کے انہدام اور سرحدیار مقیم افراد، تیز دوسرے کارکنوں کے خلاف سخت کارروائی کی سفارش کی

”پٹنہ کے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ملزمین کی جائداد [منقولہ] پر نیلام نہ بولیں۔ اور بعض منقولہ چیزیں بہت مشکل کے بعد معمولی قیمتوں پر فروخت کر دی گئیں۔“

”صادق پور کا احاطہ پٹنہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے اور تمام مکانات زمین کے برابر کر دیئے جائیں اور وہاں ایک بازار بنایا جائے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ اچھا مصروف اس زمین کا نہیں ہو سکتا۔“
جائداد غیر منقولہ تو سب ضبط ہو ہی گئی، جس کی مکمل فہرست اب بھی مل سکتی ہے۔

کانگریسی وزارت [۱۸۶۳ء - ۱۸۶۹ء] کے زمانے میں ایک ممبر کے ذریعہ مجلس قانون ساز (بہار) میں صادق پور کی ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق سوال کرایا گیا۔ جس کے جواب میں حکومت نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد ان ضبط شدہ جائدادوں کی پوری فہرست فراہم کر دی تھی۔
راولشا کی سفارش کے بموجب مکانات بھی زمین کے برابر کر دیئے گئے تھے۔ اور اب وہاں پر پٹنہ میونسپلٹی کی عمارت قائم ہے۔
۱۸۶۲ء کے زلزلے میں اس کی دوبارہ مرمت ہوئی، مگر تاریخ (قائم شدہ ۱۸۶۵ء Established 1865) اس پر درج ہے۔ میونسپلٹی کے باہر چھوٹا سا بازار بھی ہے۔ جائداد غیر منقولہ کی ضبطی کے سلسلے میں سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مولانا احمد اللہ رح کا قیمتی کتاب خانہ بھی

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

ضلع کر دیا گیا۔ مولانا کے بڑے بیٹے حکیم عبدالحمید عظیم آبادی (جو اس وقت نوجوان طبیب تھے اور بعد میں ادیب و طبیب کی حیثیت سے ہمہ گیر شہرت حاصل کی، اور استاذ الاساتذہ کے درجے پر فائز ہوئے۔ استاذ محترم مولانا سیدنا سلیمان ندوی مظلہ انھیں خاقانی ہند کے لقب سے یاد کرتے ہیں) کا مختصر سادہ و خانہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ شہر آشوب میں لکھتے ہیں۔

نام نان و نشاں قوت میرس	صورت قوت لایموت میرس
حال قوت و نشان و منزل من	عالم الغیب داند و دل من
یک دوا خانہ و جہ قوتم بود	مایہ قوت لایموتم بود
آمد آن خانہ ہم بمعرض ضبط	شد ہمہ نظم روزیم بے ربط الخ

”اس چنگیزی“ حکم کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیے۔

مختصر یہ سمجھئے کہ خاندان صادق پور کی تمام عورتیں اور بچے حکیم ارادت حسین صاحب (دفتر مکہ معظمہ ۱۲۹۷ھ) کے مکان میں پناہ گزیں ہوئے۔ حکیم صاحب بھی خاندان صادق پور سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ مقیمہ بنالہ کے

۱۵ متاخرین علمائے صادق پور سب کے سب ان ہی کے شاگرد ہیں، جس طرح اکثر متقدمین

حضرات صادق پور ان کے والد ماجد مولانا احمد اللہ (دفتر ۱۲۹۵ھ) کے شاگرد تھے۔ خاقانی بند حکیم

عبدالحمید صاحب عظیم آبادی (دفتر ۱۳۲۲ھ) سے واقف کو بھی نسبت کثرت حاصل ہے۔ استاذ

والدی مولانا حکیم محمد عبدالشکور صاحب مظلہ (مولود ۱۲۹۵ھ) نے ان سے طب کی تحصیل کی تھی۔

بائبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

بعد ہی مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے (رجب ۱۲۸۱ھ نومبر ۱۸۶۴ء) اور وہیں تیرہ برس زندگی گزار کر مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ اس لئے ان کا مکان اغیار کی دست برد سے بچ گیا۔ اور پورے صادق پور میں یہی ایک مکان ہے، جو اپنے حال پر اب تک باقی ہے۔ مردوں میں صرف حکیم عبدالحمید صاحب دیکھ بھال کے لئے تھے۔ مولوی محمد حسن صاحب

بن مولانا ولایت علی صاحب اولاً تو بہت کم سن تھے۔ دوسرے وہ کلکتہ سے لے کر انبالہ تک مقدمات کی پیروی میں سرگرداں تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی شندی میں اس بے کسی اور خانہ ویرانی کا دردناک منظر کھینچا ہے۔

ماجرائے عیال آں مظلوم

ہمہ را از مکاں بدر کووند

نقد و جنس و ہمہ اثاث ضیاع

بردن سوزنے ز جملہ رخت

حکم ہمراہ بردن سوزن

نہ غم چیب و نہ غم دامن

بچکان و زنان و شیونہا

عید ماغرہ محرم شد

کنم الحال مختصر مرقوم

چوں شب عید راسخ کر وند

ضبط و تاراج جملہ مال و متاع

بہر مایہ آہ جرمے سخت

احدے را نہ بد چہ مرد و چہ زن

ہمہ سرگشتہ بے سرو سامان

من نہ تنہا کہ ہم ہم تنہا

مایہ عیش ساز ماتم شد

حکیم ارادت حسین صاحب (ف ۱۲۹۴ھ) کا پڑانا گمراہ تک آباد ہے۔ ان کے پوتے خاندان کی روایات کے محافظ اور عالمِ باعمل ہیں۔ مولانا عبدالغفار صاحب ان میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ حکیم عبدالحمید صاحب کا اشارہ اپنے والد مولانا احمد اللہ رح کی طرف ہے۔

یہ خانہ ویرانی ٹھیک عید کی صبح کو شروع ہوئی (۱۲۸۵ھ) آزمائش پر
آزمائش !! اللہ کی پناہ !!!

”کتاب خانہ“ کی بربادی پر حکیم صاحب کے تاثرات بھی قابل ”عرض“

ہیں :-

کتب ملت مسلمانان

داند او ہر کہ با تمیز بود

راست گوئندہ این مثل گفت است

ان بیچاروں کی قلبی حالت کیا تھی؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے

شنوی کے یہ تین شعر کافی ہیں :-

صرف قند چوں دزدے تند

حسب حال این دو بیت مل میخواند

سہ صادق پور کی کتاب میں آج بھی پٹنہ کی مختلف لائبریریوں میں نظر آجاتی ہیں۔ خدائش

اور نیٹیل لائبریری میں راقم کی نظر سے علمائے صادق پور کی مہر کردہ بعض کتابیں نظر سے

گذری تھیں۔ ابھی ابھی پچھلے دنوں ایک عزیز کے ہاتھ میں پٹنہ کالج لائبریری

سے مستعار لی ہوئی ایک کتاب دیکھی، جس پر جابجا (فرحت حسین ۱۲۵۶ھ) کی

مہر لگی ہوئی ہے۔ دیکھنے پر یہ کتاب نہیں، بلکہ چند کتابوں کا مجموعہ ثابت ہوا۔

اور کتاب میں بھی سب کی سب توحید و دعوت جہاد سے متعلق۔ اس سے زیادہ

عبرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ مجموعہ پٹنہ کے ایک رئیس (جو چغل خوری میں شریک

تھے) نے پٹنہ کالج لائبریری کو ہدیہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ کے مال کا

کچھ حصہ ان ”مابین“ کے لوگوں کو بھی مل گیا تھا۔

دل ظالم بقصد کشتن ماست دل مظلوم بالبوسے خداست
اور دریں فکر تا بجا چہ کند مادرین فکر تا خدا چہ کند

راونشانے تو صرف مکانات کے انہدام کا مشورہ دیا تھا۔ مگر

”ذمہ داران امن و امان“ نے قبریں بھی کھود ڈالیں۔ مولانا عبدالرحیم
صادق پوری (ف ۱۳۴۲ھ) جب بیس سال کے بعد انڈیا سے واپس
ہوئے (سن ۱۳۴۲ھ) تو خاندانی قبرستان کا دلہ وز منظر دیکھ کر دل بھر آیا۔
اور کراہا کا تبین“ کی انتہائی سختی کے باوجود ان کی آنکھوں سے خون کے
قطرے ٹپک پڑے:-

”ہر کیف میں پیرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلے سے رخصت ہو کر محلہ
نموہیہ میں پہنچا، جہاں کہ میرے اہل و عیال مقیم تھے۔ اس کی صبح ہو کے
صادق پور گیا۔ تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کل منہدم کر کے
کف دست میدان بنا دیا گیا ہے۔ اور اس پر بازار اور میونسپلٹی کے
مکانات بنا دیئے گئے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرہ کو کہ جہاں
چودہ پشت سے ہمارے آبا و اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے، جا کر دیکھوں
اور خصوصاً اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں،
اور اس پر دعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کوشش کی، پتہ
نہ ملا۔ بعد تب بس تو فحش بسیار و غور و فکر کے قرینہ سے معلوم ہوا کہ حضرت

۱۵۷ صادق پور اور موجودہ بانگی پور کے درمیان شہر ٹپنہ کا ایک محلہ۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنادی گئی ہے۔

يَا مَنْزِلًا لِعِبَادٍ زَمَانٌ بَاهِلُهُ فَأَبَادَهُمْ بِنُفْرَقٍ لَا يَجْمَعُ

[اے وہ منزل، جس کے رہنے والے زمانے کی دست برد کے شکار ہوئے

اور انھیں زمانے نے ایسا منتشر کیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں]

إِنَّ الَّذِينَ عَاهَدُوا مَعَكَ قَدْ قَاتُوا

كَانَ الزَّمَانُ بِهِمْ يُضَيَّرُ وَيَنْفَعُ

[وہ جنہیں میں نے کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے

نفع و نقصان پہنچاتا تھا۔]

أَصْبَحْتَ تَفَزَّعُ مِنْ يَرَاكَ وَطَاءً

كُنَّا إِلَيْكَ مِنَ الْمُهَاجِرِ تَفَزَّعُ

[جو تجھے اب دیکھتا ہے، گھبرا اٹھتا ہے۔ اور کبھی مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری

آغوش میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔]

ذَهَبَ الَّذِينَ يُعَاشُ فِي الْكُنُفِ

بَقِيَ الَّذِينَ حَيَاتُهُمْ لَا تَنْفَعُ

[وہ لوگ تو گزر گئے، جن کے سائے میں زندگی، زندگی تھی۔ اب وہ لوگ رہ گئے

ہیں، جن کی زندگیاں کسی کام کی نہیں۔]

”اے حضرات ناظرین۔ اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کے

ساتھ کی گئی، جو صدمہ دل پر گذرا۔ وہ بیرون از حیطہ تقریر و تحریر ہے۔

اس وقت تک اس کی یاد سے بدن کے رونکٹے تک کھڑے ہو جاتے ہیں

یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے جرم میں ہمارے اموات و آباؤ اجداد کی

لہ ان شعروں کا ترجمہ قصداً لفظی نہیں کیا گیا۔

قبریں کیوں کر کھودی گئیں۔ اور وہ مقبرہ کیوں معرض ضبطی میں آیا ہمارے

عادل گورنمنٹ نے کیوں یہ کام کیا؟ (تذکرہ صادقہ ص ۱۴۹)

(۴) صادق پور کے مکانات کے انہدام کے علاوہ راونشا صاحب کی

ایک سفارش یہ تھی۔

”مقیم سرحد مولویوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ان کی

جائدادیں ضبط کر لی جائیں اور ان کے مقامی کارکنوں پر کڑی نگاہ رکھی

جائے خاص کر حاجی بدرالدین (ڈھاکہ) اور مولوی عبد الجبار (کلکتہ) پر

مقدمہ چلانا ضروری ہے۔“ (یادداشت ۳۲-۳۰)

راونشا کی یہ سفارشاتیں مقبول ہوئیں۔ اور پورے بہار اور بنگال

میں دار و گیر کا بازار سالہا سال تک گرم رہا۔ ان سفارشاتوں کی قبولیت

کی اطلاع سکریٹری بنگال گورنمنٹ نے کمشنر ٹپنہ ڈویرن کو ان لفظوں

میں دی۔

(i).....

(ii) حکومت پنجاب سے الہی بخش کی معافی کی کوشش کی

جائے گی، نیز اس کے مکان اور پانچ سو روپے کی واپسی کی۔

(iii-iv).....

(v) یہ تجویز کہ صادق پور کا احاطہ ٹپنہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے،

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

تاکہ اسے زمین کے برابر کر دیا جائے اور اس جگہ ایک کھلا بازار بنایا جائے۔ حکومت ہند میں پیش کی جائے گی۔ لفٹننٹ گورنر کی رائے ہے کہ جائیداد غیر منقولہ کی آمدنی کا بھی ایک حصہ نسلیٹی کو دیا جائے۔

(ان) لفٹننٹ گورنران اشخاص کے خلاف جن کا ذکر مٹھراؤنشا کی رپورٹ کی دفعہ ۳۲ میں آیا ہے۔ قانون ضابطہ فوجداری (دفعہ ۱۹۹) کے ماتحت فوری کارروائی کی اجازت دیتے ہیں۔

اس دوسرے مقدمہ سازش کی مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اس کا مقصد صرف خاندان صادق پور اور ان کے احوال و انصار کو تباہ و برباد کرنا تھا۔ خاندان کا دنیوی جاہ و جلال تو اسی مقدمے کی نذر ہو گیا۔ رہ گئے احوال و انصار، ان میں جو سخت جان رہ گئے تھے۔ ان کے لئے تین مقدمے اور چلائے گئے۔ (مائدہ ۲) ستمبر ۱۸۷۷ء، راج محل، اکتوبر ۱۸۷۷ء، پٹنہ، مئی ۱۸۷۸ء) ان مقدمات میں کیا کیا ہوا اور ناکردہ گناہوں کو سزا دینے کے لئے کیا کیا جتن کئے گئے، اس کے متعلق ایک واقف کار اور مبتلائے الم کے تاثرات ملاحظہ ہوں:-

”جو آگ گرفتاری وہاں بیان ۱۸۷۷ء میں تھا انیسویں رشن ہوئی تھی اس کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ آخر کو ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے تو ہزاروں من ولایتی بارود اور کرشن آئیل اس میں ڈال دیا۔ اور ہماری سرکار کو

یہاں تک بھڑکایا کہ صادق پور، پٹنہ کے وہ مکانات کہ جن میں قافلہ کے لوگ
 ٹھہرا کرتے تھے۔ مع مکانات سکنی ان فرضی باغیوں کے کھدوا کر کھپکھپا دیئے
 مگر اس پر بھی سرکار کا دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ ۱۸۷۲ء کے آخر تک پٹنہ اور
 بنگال میں سلسلہ گرفتاریاں لے گناہوں کو جاری رکھا۔ بیچارہ امیر خاں
 سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ بہت سے آدمی پٹنہ میں پکڑ لئے۔
 مولوی امیر الدین صاحب کو پٹنہ میں جا پکڑا۔ ایک بوڑھے اور ضعیف
 شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں۔ اور اپنے معمولی اور پرانے
 گناہوں سے جو چاہا، گواہی دلوں اور بیچاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا۔ اور
 امیر خاں کی چند کروڑ کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا۔
 ”اور پھر ۱۸۷۲ء تک جو مقدمات گرفتاری وہاں یاں مثل مقدمہ
 امیر خاں صاحب سوداگر چرم و مولوی تبارک علی صاحب و مولوی
 امیر الدین ساکن پٹنہ و ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور پہنچتے رہے، تو
 بھی معمولی گواہ یا گویندہ سرکار چھوٹی گواہی دینے کو بلاتے جاتے تھے۔ اور
 میں نے خود ان میں سے ایک گواہ کی زبانی سنا ہے کہ جب کبھی خلاف
 گواہی دینے سے ہم نے انکار بھی کیا، تو ہم کو یہ کہا گیا کہ تم لوگ شہر طیبہ طور پر
 فقط اسی گواہی دینے کے واسطے بطور گویندہ رہا کئے گئے ہو۔ اگر گواہی
 نہ دے گے تو پھر تم کو دائم الحبس کر کے پہلے ہی وارنٹ پر کالے پانی کو بھیج دیا
 جائے گا۔“ (تاریخ عجیب ص ۷۹) (۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۳ء)

تیسرا مقدمہ سازش :- مالدہ ۱۸۶۱ء مالدہ اور راج محل کے
مقدموں کی تفصیلی روداد

نہیں مل سکی۔ پھر بھی انبالہ اور پٹنہ کے دونوں مقدموں (۱۸۶۵ء اور
۱۸۶۷ء) کی رپورٹوں اور سرکاری کرم فرماؤں کی تحریروں سے
جو کچھ معلوم ہو سکا ہے، وہ درج ذیل ہے :-

”مقدمہ انبالہ کے بعد وہابی اپنا پروپگنڈا کرتے رہے۔ تا آنکہ حکومت
تشدد پر مجبور ہو گئی۔ اور مختلف مقدمات چلائے گئے۔ ۱۸۶۵ء کا مقدمہ
سازش، پٹنہ بھی اسی سلسلے میں چلایا گیا تھا۔ پھر کچھ سراغ ملا۔ تو ۱۸۶۷ء
میں مالدہ اور راج محل کے مقدمے دائر ہوئے۔“

۱۸۶۷ء کے دو مقدموں میں، پہلا مالدہ میں مولوی امیر الدین پر
چلایا گیا۔ مولوی امیر الدین کون تھے؟ ایک صاحب لکھتے ہیں :-
”مولانا ولایت علی کے خلیفہ عبدالرحمن لکھنوی نے مالدہ میں تبلیغ کی
اور وہیں بس گئے۔ ان کے کارکنوں میں ایک صاحب رفیق منڈل
نامی تھے۔ وہ ۱۸۵۳ء میں گرفتار ہوئے، پھر رہا کر دیئے گئے۔“

اس کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے امیر الدین کے ذمہ یہ خدمت کی
۱۸۶۵ء کے مقدمے کے دوران میں امیر الدین کی شرکت کا راز کھلا
لیکن وہ اپنا کام کرتا رہا۔ ان کے حلقے میں پورا مالدہ صلع اور راج شاہی اور

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک
مرشد آباد کے کچھ حصے تھے۔

۱۶۳

”ایک شخص عبد الرحمن نامی (خلیفہ مولانا ولایت علیؒ) والدہ، تبلیغ کرتے ہوئے آئے۔ پھر وہ وہاں رہ پڑے۔ شادی کر لی۔ اور ایک اسکول میں معلم ہو گئے۔ ان کی تبلیغ کامیاب ہوئی۔ آدمی اور رقم سرحد کو بھیجتے رہے۔ سالہا سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۳ء میں ان پر شبہ ہوا، گرفتار ہوئے، پھر چھوڑ دیئے گئے۔

”اس کے بعد ان کا کام اُن کے بیٹے مولوی امیر الدین نے سنبھالا جنہوں نے اپنے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیئے۔ مقدمہ پٹنہ ۱۸۶۵ء میں اُن پر شبہ ہوا۔ تنبیہ کی گئی، لیکن یہ اپنا کام زور و شور سے کرتے رہے اور مقدمہ والدہ کے افسرانچارج کے غیر جانبدارانہ بلکہ ایک حد تک قدردانی کے الفاظ میں اُس نے اس وقت سے لے کر گرفتاری تک نہایت ایمانداری سے جہاد کو جاری رکھنے کے لئے بھرتی کرنے کی کوشش کی۔

۱۸۷۰ء جنرل رائٹ ایسٹنک سوسائٹی بمبئی :- جلد ۱۴ ص ۳۷

۱۸۷۰ء ہنٹر نے مولوی امیر الدین کو مولوی عبد الرحمن کا بیٹا لکھا ہے۔ حالانکہ راؤ نشانے (ولد رفیق منڈلی) کی تصریح کی ہے۔ نیز رفیق منڈل کے حالات میں راؤ نشانے لکھا ہے :-
”اُس کا بیٹا شکور محمد آج کل ستھانہ میں رہتا ہے اور دوسرا لوط کا، جس کا نام نہیں معلوم، آج کل مضافات میں تبلیغ و تحصیل کا کام کرتا ہے۔“

۱۸۷۰ء ہنٹر :- ص ۳۷

راونشا کی یادداشت میں والدہ کے کارکنوں کے بارے میں حسب

ذیل بیان ملتا ہے :-

”راج شاہی کی طرح اس ضلع میں بھی جماعت بہت نمایاں ہے۔ اسی زمانے میں شیخ اللہ منڈل نے رپے جمع کئے، جو ایک مولوی کو دیئے، جو چند مریدوں کے ساتھ گاؤں میں تبلیغ کے لئے آیا تھا۔ اس مولوی کا نام امیر الدین (ولد رفیق منڈل) ہے۔ کچھ دن ہوئے، یہ بغاوت پھیلانے کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا۔ اور مرشد آباد جیل میں محبوس رہا تھا۔“

ان میں مولوی امیر الدین صاحب پر والدہ میں بغاوت کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ ہائی کورٹ سے جس دوام بعبور دریاے شور اور املاک کی ضبطی کی سزا ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔

مولوی محمد جعفر صاحب کے بیان کے مطابق انھیں انڈمان میں ایک مدت تک سخت مشقت برداشت کرنا پڑی۔ بعد میں ایک مدرسہ کے معلم بنادئے گئے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں عام رہائی کے حکم سے انھیں بھی فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ اور صرف دس گیارہ سال جلاوطنی میں بسر کرنے کے بعد وطن واپس ہو گئے۔

چوتھا مقدمہ سازش۔ راج محل اکتوبر ۱۸۷۲ء

۱۸۷۲ء - راج محل پہلے والدہ ضلع میں تھا۔ پھر مرشد آباد (بنگال) میں فہم کر دیا گیا۔ آج کل سننقہال پرگنہ (بھاگپور و کمشنری - بہار) میں شامل ہے۔

اندرواقع ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ مالدار ضلع، گوبنگال میں ہے، لیکن
 دریا کی راہ سے راج محل اور مالدار بالکل ملے ہوئے ہیں۔ راج محل کے
 نواح میں ایک قصبہ اسلام پور ہے۔ وہیں ایک بزرگ ابراہیم منڈل
 تھے جنہیں مجاہدین کی تحریک سے خاص دلچسپی تھی۔ منڈل اس نواح
 میں چودھری یا پٹیل کہلاتے ہیں۔ راونشا کے "اسماء الرجال" میں کئی بزرگ
 "منڈلی" کے نام سے موسوم نظر آتے ہیں۔ یہ لفظ منڈل ہے۔ یہ قصبہ اسلام
 پور آج بھی اس نواح میں اپنی دینداری اور اخلاقی برتری کے لحاظ سے
 ممتاز ہے۔ راقم نے اپنے ملنے والوں میں پروفیسر عبدالباری مرحوم کو ان
 لوگوں کی دینداری کا بہت مداح پایا۔ اسی طرح اپنے ایک دوسرے
 دوست منظور احسن صاحب کو، (جو اس علاقے میں پتھروں کا کاروبار
 کرتے تھے) اسلام پور والوں کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔

خلاصہ یہ کہ مالدار کے بعد فوراً ہی راج محل میں ابراہیم منڈل پر
 مقدمہ دائر کیا گیا۔ (اکتوبر ۱۸۵۷ء) اور تمام ملزموں کی طرح انہیں
 بھی "شہادت" سے محروم رکھا گیا۔ اور صرف "حبس و دام بعبور دریا" سے
 شور اور ضبطی جائداد کی سزا ہوئی۔ ابراہیم منڈل کے متعلق ذاتی تحقیق سے
 صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ اصحاب صادق پور میں سے کسی کے مرید تھے۔
 اور راج محل کے علاقے میں ان کی دھاک تھی۔ اب بھی ان کے خاندان کے

ساتھ بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر جو اسی حلقے سے اسمبلی کے لئے منتخب ہوا کرتے تھے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

لوگ خوش حال ہیں، مگر وہ آگ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ ان کے وطن اسلام پور میں ایک مدرسہ بھی ہے۔ رسالہ اشاعت السنۃ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ امیر خاں کے ساتھ ۱۸۷۰ء میں لارڈ لٹن (۱۸۷۱ء - ۱۸۸۰ء) کے حکم سے رہا کر دیئے گئے تھے۔ اور غالباً انڈمان بھی نہیں بھیجے گئے۔ ہنٹر نے والدہ اور راج محل کے مقدموں کی طرف صرف سرسری طور پر اشارہ کیا ہے:-

”۱۸۷۰ء میں ایسے [یعنی اضلاع کے] دو مرکز *Sehlements* توڑ دیئے گئے۔ ان کے سرکردہ مبلغوں کو غیر جانبدار عدالتوں سے عبور دریاٹے شور اور ضبطی املاک کی سزا ہوئی۔ ان کی سازش کا جال، برطانیہ کے علاوہ کسی کمزور حکومت کو بہ آسانی مرعوب کر سکتا تھا۔

”غیر جانبدار عدالتوں کا تجربہ تو اس ملک کے ستم زدوں کو ہزار بار ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ اس سلسلے میں یہ بیان شاید دلچسپی سے سنا جائے کہ مجاہدین کے ایک بڑے کرم فرما اور

ان سب میں جماعت سے زیادہ واقف، مسٹر اؤکینلی *James Okinely*

۱۸۷۱ء میں تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے انتقال کو چالیس پینتالیس برس ہوتے ہیں۔ ان کے پوتے اس وقت زندہ ہیں اور انہی ایسے لوگ زندہ ہیں، جنہوں نے ابراہیم منڈل کو دیکھا ہے

ان مقدموں میں خاص طور پر سرکار کی طرف سے پیروکار مقرر کئے گئے تھے۔ اور انھوں نے، ہمیں راج محل میں بیٹھ کر مولانا کرامت علی جون پوری (ف ۱۲۹ھ ۱۸۷۳ء) جن کے بارے میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ ان کی روش، سید صاحب کے اصحاب خاص کے مسلک سے الگ ہو گئی تھی (کو یہ سند عطا کی ہے، جسے ان کے عزیزوں اور معتقدوں نے ۱۹۱۴ء میں نہایت دیدہ زیب طریقے پر طبع کرایا تھا، تاکہ "وقت پر کام آئے"۔

"میں نے، مولانا کرامت علی جون پوری کی تمام تصنیفات پڑھنے کی مسرت حاصل کی ہے اور اپنے علم کی بناء پر شہادت دے سکتا ہوں کہ انھوں نے اپنے کو ہمیشہ ایک راسخ العقیدہ (Orthodox) حنفی عالم و ہابیوں کے کٹر دشمن (Persistent Opponent) اور ہندستان میں برطانوی حکومت کے ہوا خواہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

پانچواں مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۷۱ء | یہ آخری مقدمہ سازش پٹنہ میں دائر ہوا۔

اور بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔ پہلی مارچ ۱۸۷۱ء میں مسٹر باربر (D. M. Barbour) آفیشنگ جائنٹ مجسٹریٹ، پٹنہ کے اجلاس میں اس کی سماعت ہوئی۔ مجسٹریٹ نے، ۲ مارچ کو ملازموں پر

۱۸۷۱ء کو برائے نام، یعنی مقدمہ کی پیروی کے دوران میں یاد و چار دن بعد۔
مسٹر نے بھی مولوی کرامت علی صاحب کے ایک مفادارانہ فتویٰ کا ذکر کیا ہے (صفحہ ۱)

فوجرم عائد کر کے سیشن سپرد کیا۔ اور پہلی مئی کو مقدمہ کے آغاز پر کل ۱۳۶ سرکاری گواہوں اور کچھ ملزموں کے گواہوں کو حاضری کا حکم دیا گیا۔

”یہ گواہ [شمالی] ہندستان کے تقریباً ہر حصے کے تھے۔ پشاور، ہزارہ اور ماورائے سرحد سے لے کر مدناپور اور باقر گج جیسے مشرقی اضلاع (بنگال) سے یہ گواہ لائے گئے تھے۔ بعض عذروں کی بناء پر کلکتہ ہائی

کورٹ کو انتقال مقدمہ کی درخواست کی گئی۔ اور اس لئے ۱۳ مئی تک سماعت تو یہی رہی۔ ہائیکورٹ نے انتقال مقدمہ کی درخواست نامنظور کی۔ تو التواء کی درخواست دی گئی، جس پر ہائیکورٹ نے ۲۹ مئی تک سماعت کے التواء کا حکم دیا۔

”یہ حکم بالکل غیر عادی تھا۔ اس لئے کہ اس عدالت میں کوئی ایسی درخواست نہیں دی گئی تھی، جس پر اسے تعزیرات ہند کی دفعہ (۳۶۱) کے مطابق غور کرنے کا موقع ملتا۔

اس کے بعد جج صاحب نے ہائی کورٹ کی زیادتیوں کا شکوہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مقدمہ ۲۰ مئی کو شروع ہوا۔ اور کچھ وقفوں کے ساتھ ۱۹ رجب لائی تک جاری رہا۔ کل ۳۸ روز مقدمے کی سماعت ہوئی۔ جس میں سب ملّا کر ۵۹ گواہ پیش ہوئے (۱۱۳ سرکار کی طرف سے اور ۶۶ ملزموں کی جانب سے)۔ ان کے علاوہ خطوط اور کاغذات کے انبار نے بھی اچھا خاصہ وقت لیا۔

اس مقدمے میں کل سات ملزم تھے: ۱۔ پیر محمد، ۲۔ امیر خاں، ۳۔ حشمد اذخاں

مبارک علی، تبارک علی، حاجی دین محمد، امین الدین۔

ملزموں میں جماعتی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم مولوی مبارک علی صاحب تھے۔ ان کا ذکر تنظیم جماعت کے سلسلے میں آچکا ہے۔ مولانا احمد اللہ (ف ۱۲۹۸ھ) کی گرفتاری (۱۲۸۱ھ) کے بعد یہ جماعت کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہوئے۔ انبالہ اور پٹنہ کے مقدموں کی پیروی میں مولوی محمد حسن صاحب (ف ۱۳۰۹ھ) کی بڑی مدد کی۔ انبالہ کا سفر بھی کیا۔ آخر ۱۲۸۴ھ میں گرفتار ہوئے۔ پھر ۱۲۸۷ھ کے آخری مقدمہ سازش میں دھر گھسیٹے گئے۔ اور سخت اذیت دی گئی، تا آنکہ اسی حال میں روح نے جسم خاکی سے رہائی حاصل کی [ف ۱۲۸۸ھ]۔ ان کے صاحبزادے مولوی تبارک علی بھی اس مقدمے میں مانخوئے تھے۔

”جرم“ کی نوعیت کے لحاظ سے ان کا نام سب سے پہلے آنا چاہئے۔ ان پر الزام تھا کہ وہ مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۲ھ) کے ساتھ امبیلہ کی مہم (۱۲۸۶ھ) میں شریک تھے، اور ایک دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ حاجی دین محمد اور امین الدین پر باغیوں کی اغانت کا الزام تھا۔ حشمداد خاں کو شش جج نے رہا کر دیا کہ ان کے خلاف بادی النظر میں مقدمہ (Prima-Facie Case) ثابت نہ ہو سکا۔ پیر محمد ہائی کورٹ سے

۱۔ وہ مقدمہ جس میں شہادت ایسی ہو کہ اس کی تردید کے لئے فریق مخالف کو لازم جواب دہی کرنا پڑے

Prima Facie کا لفظی ترجمہ On the Face of it (بادی النظر میں) ہے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

بڑی ہوئے۔ لیکن ان سب میں عجیب و غریب معاملہ امیر خاں کا ہے۔

اور اس آخری مقدمے کی ساری اہمیت ان ہی کی وجہ سے ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ملزم "مختلف وقتوں میں گرفتار کئے گئے اور کبھی کبھی درمیان میں رہا بھی کئے گئے۔ لیکن مقدمہ ۱۸۶۸ء

میں ایک ساتھ چلایا گیا۔ مولوی مبارک علی ۱۸۶۸ء میں مشتبہ خطوط کے

سلسلے میں گرفتار کئے گئے۔ حاجی دین محمد، پیر محمد، تبارک علی ۱۸۶۸ء،

۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء میں مختلف وارنٹوں کے ماتحت گرفتار کئے گئے۔

اور بار بار ممالک مغربی و شمالی [موجودہ صوبہ جات متحدہ] اور پنجاب

کے جیلوں میں منتقل کئے گئے۔

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ مبارک علی، تبارک علی، امین الدین

حاجی دین محمد جو مختلف وقتوں (۱۸۶۸ء - ۱۸۶۹ء) میں ٹیٹ

پر زہر "State Prisoner" کی حیثیت سے گرفتار کئے گئے تھے۔

جنوری ۱۸۷۰ء میں رہا ہوئے اور پھر اس مقدمے کے لئے از سر نو

گرفتار کئے گئے۔

لیکن جیسا کہ راقم نے ابھی عرض کیا، ان سب "اسیرانِ بلا" میں

امیر خاں کا معاملہ سب سے عجیب و غریب ہے۔ یہ بیٹنہ، محلہ عالم گنج کوٹہ

۱۷۲

ٹیٹ پر زہر سے مراد وہ شخص ہے، جو ریگولیشن ۱۸۱۸ء کے تحت قید کیا گیا ہو۔

والے اور کروڑ پتی تاجر تھے۔ ان کا چمڑے کا کاروبار بنگال اور بہار میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بڑے بڑے انگریز تاجر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ان کی تجارت تباہ کرنے اور ساری جائداد ضبط کرنے کے لئے ان پر اتنا "شاندار مقدمہ" تصنیف کیا گیا، جس میں ۱۱۳ سرکاری گواہ پیش ہوئے اور مسٹر اگنلے جیسے گرگ باراں دیدہ "کو سرکاری پیرو کار مقرر کیا گیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ امیر خاں کو مجاہدین اور ان کے نصب العین سے لگاؤ تھا۔ خود حضرت سید شہیدؒ یا مولانا ولایت علیؒ صادق پوری (ف ۱۲۶۹ھ) سے بیعت تھی۔ اور جہاد کے کاموں میں رپے سے مدد کیا کرتے تھے۔ زکوٰۃ کی رقمیں باضابطہ طور پر ادا کرتے۔ بنگال کے مشرقی اضلاع سے جو رقمیں آتیں، وہ بسا اوقات انھیں کے کلکتہ والے فرم کے واسطے سے پٹنہ اور پنجاب کو بھیجی جاتیں۔ مگر حکومت نے انھیں سزا دینے اور ان کی جائداد کی ضبطی کے لئے جو کارروائیاں کیں، وہ اسی حکومت کے قانون دانوں اور رہنماؤں کی نگاہ میں غیر منصفانہ اور خلاف قانون تھیں۔

مسٹر رھٹسک (E. Rehatsek) نے اس مشہور مقدمے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ انھیں کے لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اس مقدمہ سازش کی، غرض و غایت، معلوم ہو جائے گی۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

”وہابی، حکومت، نیز دوسرے مسلمان فرقوں کی نگاہوں میں جس قدر بدنام ہیں، اس لئے امیر خاں اور حشمت ادا خاں نامی قیدیوں نے جن کا مقدمہ جسٹس نارمن (Norman) کی ملکہ وہابی کورٹ کے اجلاس میں پیش ہوا تھا، اور اپنے وہابی ہونے کا اقرار نہیں کیا۔ اسی لئے ایک پبلٹ مشہور وہابی مقدمہ (The Great Wahabi Case) کے مرتب کرنے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے صرف مقدمے کا مشہور نام قائم رکھا ہے۔ ان کا یہ مقصد نہیں کہ یہ لوگ واقعی وہابی ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے حلفیہ بیان دیا ہے، کہ یہ سستی ہیں۔“

”اصل مقدمہ پٹنہ میں دائر ہوا تھا، جس کی پیروی مسٹر انگرام (Ingram) نے کی۔ صرف ہمیں کوریس (Habeas Corpus) کی سماعت ملکہ

۱۔ جنرل رائٹ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۴ ص ۳۷۷
 ۲۔ Habeas Corpus کے لفظی معنی (Have the body) کے ہیں۔
 اور توضیح یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو حکومت کی عاملہ یا پولیس یا کوئی غیر سرکاری شخص خلاف قانون قید یا حبس میں ڈال دے، تو اس شخص کو یا اس کی طرف سے ہر کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہائی کورٹ کے کسی جج کے پاس جا کر درخواست کرے کہ فلاں شخص کو خلاف قانون مجبوس کر دیا گیا ہے۔ تو جج فوری ثانی کے نام حکم نامہ جاری کرے گا کہ وہ اگر وجہ بیان کرے کہ کیوں اس کے خلاف (Writ of Habeas Corpus) (مجبوس شخص کی آزادی کا حکم) جاری نہ جائے؟ اور اگر عاقل کوئی قانونی وجہ نہ بیان کر سکے، جو جج کی نگاہ میں جائز ہو، تو جج وہابی کا حکم دیدے گا۔ یعنی (Writ of Habeas Corpus) جاری کر دے گا۔
 مختصر طور پر پولیس سمجھے کہ (Habeas Corpus) ایک حق ہے۔ تعزیرات ہند کے ماتحت تمام برطانوی رعایا کو حاصل ہے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

۱۷۳

میں ہوئی۔ مشہور پیر سٹر انسٹی (Anstey) کو بیٹی سے کلکتہ لایا گیا۔ اور مقدمہ، راکست ۱۸۷۸ء شروع ہو کر ۸ ستمبر کو ختم ہوا مختلف دفعوں کے ساتھ مقدمے کی سماعت صرف نو روز ہوئی۔

امیر خاں، عمر ۷۵ سال، جو کہ چڑے کا تاجر تھا، ریگولیشن ۱۸۱۷ء کے ماتحت گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے حسب ذیل درخواست اپنے وکیل کے ذریعہ دی:-

”قیدی ملکہ کا ایک وفادار رعایا ہے۔ سالہا سال سے کلکتہ میں تجارت کرتا ہے، سنیچر، ۱۰ جولائی ۱۸۶۹ء کو ایک بچے بغیر کسی قانونی (Lawful) وارنٹ کے اپنے جائے قیام کو لوٹنے سے گرفتار کیا گیا۔ اسے بالکل خبر نہیں، کہ کیوں اور کس کے حکم سے وہ گرفتار ہوا ہے۔ حالانکہ اس نے وجہ دریافت کی تھی۔ وہ اپنے گھر سے ہوڑہ (ای، آئی ریگولیشن) لایا گیا۔ جو اس عدالت کے عدالتی اختیار (سے باہر ہے۔ پھر وہ گیا [بہار] بھیجا گیا، جہاں وہ ۳۱ اگست ۱۸۶۹ء تک رہا۔ پھر اسے علی پور جیل [کلکتہ] منتقل کر دیا گیا۔

دوسرے قیدی حشمداد خاں نے ۱۸۷۸ء کو لفٹنٹ گورنر

بنگال کی خدمت میں ایک میموریل پیش کیا، کہ اسے رہا کیا جائے یا جلد از جلد اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ لفٹنٹ گورنر نے جواب دیا کہ نہ تو

۱۸۷۸ء کلکتہ کا ایک آباد محلہ، جہاں زیادہ تر مسلمان تاجروں کی دکانیں اور آڑھتیں ہیں۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

وہ رپا کیا جاسکتا ہے اور نہ مقدمہ ہی چلایا جاسکتا ہے۔ اور چونکہ وہ ریگولیشن ۱۸۸۰ء کے ماتحت گرفتار کیا گیا ہے اس لئے نہ تو یہ معمول ہے اور نہ حکومت کی نظر میں ضروری ہے کہ اسے وارنٹ کی نقل فراہم کی جائے۔

امیر خاں کے مقدمے کی پیروی پہلے مسٹر Anstey نے کی۔
 پھر وہ بمبئی واپس چلا آیا، اس پر انگلش مین نے یہ الزام لگایا کہ مسٹر
 (Anstey) فیس کی کمی کے باعث بد دل ہو کر چلے گئے، جس کی
 انہوں نے تردید کی اور اس مقدمے کو "شرمناک" بتایا۔
 آکٹوین ون جیسٹس نارمن نے ایک لمبا فیصلہ سنایا، جو شواہد و مقدمات
 سے بھرا تھا، جس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا:-

۱۵۔ اس غیر معمولی حربے (ریگولیشن ۱۸۱۸) کے جواز میں ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب کے پورے تین صفحے صرف لکھے ہیں۔ یہ ریگولیشن موجودہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کا پیش رو ہے۔ یہ صوبہ بنگال میں رائج تھا۔ اس کے مقابلے میں صوبہ مدراس میں ریگولیشن II، سلطان پور بمبئی میں ریگولیشن VIII، سلطان پور راج تھے۔ چونکہ اس وقت کوئی مرکزی مجلس قانون ساز نہیں تھی۔ اس لئے یہ ریگولیشن گورنر کے اختیار سے جاری کئے جاتے تھے۔ ان سب کا مقصد وہی تھا، جو آج ڈیفنس ایکٹ کی غرض بتائی جاتی ہے یعنی حکومت وقت کے خلاف منشاء کار روایوں کو ختم کرنے کے لئے امن عامہ کا تحفظ۔

۱۶۔ اس وقت کا مشہور نیم سرکاری اخبار -

The shameful case miscalled
Wahabi enquiry

”وجہ مذکورہ بالا کی بنیاد پر میری رائے یہ ہے کہ امیر خاں کو بذاتِ خاص حاضر کرنے کے لئے (Habeas Corpus) کا حکم نامہ (Writ) جاری کرنا (Issue) مناسب نہیں اور [جو کارروائی ہوئی ہے] اس سے قانون (Rule) کا نشانہ پورا ہو جائے گا جس کے تحت یہ کارروائی کی جا رہی تھی۔

”اصل مقدمے کی پیروی مسٹر انگرام (Ingram) نے کی۔ یہ بڑا مشہور بیرسٹر تھا۔ اس کی آمدنی کا کم سے کم تخمینہ ایک لاکھ کیا جاتا ہے۔ پٹنہ سے کلکتہ انتقال کی درخواست دی گئی۔ لیکن ہائی کورٹ نے نا منظور کیا۔ ایڈووکیٹ جنرل نے سپریم کورٹ کی ہدایت کے بموجب انتقال مقدمہ کی سخت مخالفت کی۔“

”یہ مقدمہ ذاتی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ سرکاری علقوں کا خیال یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان مجرموں کی سزا ہو جانا چاہئے۔ اور یہ کلکتہ میں پایمکن تھا۔“

امیر خاں پہلے پہل مقدمہ سازش انبالہ کے دوران میں گرفتار ہوئے۔

۱۵ مسٹر انگرام کے علاوہ مسٹر لگنم (Lignam) اور مسٹر منڈس (Mendes) بعض دوسرے ملزموں کی طرف سے پیوکار تھے۔ اور بعض ملزمیوں کی طرف سے کوئی کیل نہیں تھا۔ عجیب بات ہے کہ انبالہ (۱۸۶۳ء) سے لے کر پٹنہ (۱۸۶۸ء) تک دفاع کے تمام وکیل یورپین تھے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

میجر یارسن، خاص طور پر انبالہ سے بچھے گئے تھے۔ اور اسی نے خانہ تلاشی لی تھی۔ جرح کے جواب میں اس نے یہ اعتراف کیا کہ وارنٹ کے بغیر اس نے خانہ تلاشی لی تھی۔ اور گرفتار کر کے مسٹر ریلی (Rely) کے گھر میں ایک شب رکھا گیا۔ پھر انھیں ہوڑہ بھیج دیا گیا۔

مقدمہ کی روداد سے متعلق دو چار باتیں اور مسٹر رہٹسک (Rehatsek) کی زبان سے، سن لیجئے:-

”امیر خاں [پہلے پہل] ۱۸۶۴ء [رمضان ۱۲۸۵ھ]، مقدمہ انبالہ کے دوران میں [میں گرفتار کیا گیا۔ پھر ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء [ربیع الاول ۱۲۸۶ھ] اس گرفتار ہوا۔ اور پہلی مئی ۱۸۷۱ء تک (جب کہ ان کا مقدمہ پٹنہ میں شروع ہوا) کسی قانونی وارنٹ کے بغیر، صرف گورنر جنرل کی مرضی پر قید رکھا گیا۔“

”مقدمہ مئی، جون، جولائی تین مہینے جاری رہا۔ شہادتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے متعلق بہت کم کہا گیا ہے۔ رپے کے معاملے میں امیر خاں بہت فیاض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے، کہ ان کا تعلق جہاد سے ثابت کیا جائے۔“

جولائی کے شروع میں حتمہ ادخاں کو پٹنہ کے شن جج نے رہا کر دیا۔ اس لئے کہ ان کے خلاف الزام (Prima Facie Case) ثابت نہ ہو سکا۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک
 ۱۷۷
 پیر محمد کو بھی رہا کر دیا گیا۔ حج کی رائے میں ان کے خلاف کافی
 شہادت نہ تھی۔

”باقی پانچ آدمیوں (بشمول امیر خاں) کو جیس دوام کی سزا ملی۔
 اس عمر آدمی (امیر خاں) نے اپیل کی، لیکن بے سود۔ آخر اتنی ترمیم
 ہوئی کہ انھیں ہندستان ہی میں رکھا جائے۔ ۱۸۷۹ء میں رہا کئے
 گئے۔ اور شاید رہائی کے ایک یا دو دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔“
 امیر خاں کے مقدمے کی ساری اہمیت ان کی کروڑوں روپے
 کی جائیداد کی وجہ سے تھی۔ آخر کیا بات ہے کہ انبالہ، پٹنہ، مالدہ اور
 راج محل کے مقدموں میں دو چار گواہوں سے سرکار کا کام چل گیا۔
 مگر اس آخری مقدمے میں سرکار کو ملک کے طول و عرض سے ۱۱ گواہ
 بلانا پڑے۔ اس پر بھی خود ایک انگریز مبصر کی زبان میں ”ملزموں کے
 خلاف گواہوں نے بہت کم کہا۔“

وہ بے چارے کہتے ہیں؟ انھیں تو رٹی ہوئی داستان سنانا تھی
 ۱۸۷۹ء کے مقدمے کی پوری روداد ہمارے سامنے ہے۔ راقم نے اس کا
 حرف حرف بار بار پڑھا ہے۔ امیر خاں کے ”جرم“ کے اعتراف کے باوجود

۱۵۱
 ان میں سے اکثر گواہوں کو کافی انعامات بھی دئے گئے (ملاحظہ ہو:۔ قاضی میاں جان مقدمہ
 انبالہ) کے بھائی قاضی مراد کی شہادت (گواہ انبالہ، پٹنہ، مالدہ، راج محل) وہابی ٹرائل
 ۲۷ جنرل رائٹ ایٹیاٹک، بمبئی، رمٹک کا مقالہ۔

یہ کہنا پڑتا ہے کہ مقدمے کی روداد سے ان کا جرم "شائبہ" ہو جاتا ہے۔

ہاں! تو جیسا کہ راقم نے عرض کیا، حکومت امیر خاں کی جائداد ضبط کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس نے کر کے دکھا دیا۔ بعد کو "ضعیفی" کے باعث انھیں رہا کر دیا گیا۔ مگر جائداد کا ایک حصہ واپس نہیں ملا۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانوی لکھتے ہیں:-

"اپنے معمولی پرانے گواہوں سے جو چاہا، گواہی دلا کر بیچاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا۔ اور امیر خاں کی چند کروڑوں کی جائداد سے اپنا کل خرچہ پورا کر لیا۔ اگرچہ اس امیر خاں کو باوجود دائم الحبسی کے چار برس بعد گورنمنٹ نے مفت کا احسان رکھ کے چھوڑ دیا اور ایک حصہ جائداد منضبطہ سے واپس نہ دیا۔ اگرچہ چار برس پہلے الزام سے بری ہو کر چھوٹ جاتا۔ تو اپنی کروڑوں کی جائداد منضبطہ بھی سرکار سے واپس لے لیتا۔"

اس مقدمے کے دوران میں پولیس نے کیا کیا بے عنوانیاں کیں اور کس کس طرح بے گناہوں کو تنگ کیا، اس کا ہر کا سا اندازہ ماسٹر پرنسپ (H. T. Princip) شین جج پٹنہ (۱۸۷۱ء) کے مندرجہ ذیل ریمارک سے ہوگا۔ مقدمہ انبالہ کی تفتیش کے سلسلے میں میجر پارسن ہڈرٹ

(۱۸۷۹ء) میں رہائی کا ذکر کرتا ہے۔ گویا انبالی کے آٹھ برس

بعد اس واقعہ اشاعت السنۃ (جلد ۵، ص ۱۲) میں رہائی کی تاریخ سنہ ۱۲۷۷ھ دی گئی ہے۔

تاریخ عجیب: ص ۷۷

سپرٹنڈنٹ پولیس انبالہ، کلکتہ تشہیف لائے گئے اور ان کے مشورے سے امیر خاں کو گرفتار کر کے مسٹر ریلی پولیس افسر کلکتہ کے گھر میں رکھا گیا۔ پھر چند مہینوں کے بعد انھیں چھوڑ دیا گیا اور کاغذات واپس کئے گئے۔ یہ ساری کارروائی من مانی تھی۔ اس پر سشن جج، پٹنہ کاریمارک ملاحظہ ہو۔

”مصاحب علی [امیر خاں کا ملازم] اور امیر خاں خانہ تماشائی کے بعد رات کو مسٹر ریلی کے گھر لے جائے گئے۔ امیر خاں سے ضمانت لی گئی اور باقی اسی شام کو میجر پارسن کے ساتھ انبالہ بھیجے گئے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر ریلی کے گھر پر چند مہینے حاضر رہنے کے بعد امیر خاں کو چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کے خطوط و کاغذات جو مسٹر ریلی کے ہاتھ سے آگے نہیں بڑھے، واپس کئے گئے۔ میں ان کارروائیوں کا ذکر کر رہا ہوں، اس لئے کہ یہ سب بالکل غیر قانونی تھیں۔ اور گو موجودہ مقدمے پر ان کا فوری اثر نہیں پڑتا، ان کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ہندستان میں سراغ رسائی کی پولیس رکھنا مطلوب ہے، تو اس کے افسروں کو پولیس افسروں کے عام قانون سے اپنے کو برتر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ان معاملات میں

۱۔ ایک طرف پولیس افسروں کی یہ زیادتیاں ہیں۔ دوسری جانب سرکار کی ان پر خاص نوازش کا بھی حال سن لیجئے۔ ایشوری پرشاد، پولیس انسپکٹر، پٹنہ (جس نے انبالہ [۱۸۶۷ء] اور پٹنہ [۱۸۶۵ء] کے مقدموں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اسیران بلا کو دوبارہ پھانسنے کے لئے اس نے انڈمان تک کا سفر کیا) کی ترقی کی سفارش خود راولنشا نے اپنی یادداشت (لقیہ منقولہ) میں

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

بے لگام آزادی اختیارات کے غلط اور ناروا استعمال پر نتیجہ ہو۔

اور سازش کے پانچ مقدموں کا

بعضے دوسرے گرفتارانِ بلا اختصار ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ

معنی نہیں کہ صرف یہی حضرات قید و محن میں مبتلا کئے گئے۔ ۱۸۴۹ء سے

۱۸۵۷ء تک گرفتاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بڑی تعداد کچھ لے دے کر

چھوڑ دی گئی۔ کچھ بے قانون اور بے سزا حوالات اور جیلوں میں سڑتے

رہے۔ ایک اچھی خاصی جماعت وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور کی گئی۔

۱۸۵۷ء کے مقدمے کی ”روداد“ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ الہی

بخش (برادر حقیقی میر مقصود علی امیر المجاہدین و شاہ) قاضی مراد

(برادر حقیقی قاضی میاں جان مٹھم سازش انبالہ) الہی بخش، محمد شفیع، عبدالکریم

(سزایافتگان انبالہ) عبداللہ قواعدی (جو مجاہدین کو قواعد سکھانے پر مامور

تھا) قاری امداد علی (ایک ممتاز جہادی کارکن) اور ان جیسے بیسیوں

دوسرے آزمودہ کار کارکنوں کی ”گواہیاں“ پڑھ کر عبرت ہوتی ہے، اور

ان بیچاروں پر ترس آتا ہے۔ اللہ جانے، کن کن دھمکیوں اور سختیوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹) (فہرست ۳) میں کی تھی۔ جو قبول ہوئی اور غالباً مسیحا کی کلکٹر بنایا گیا سیر لفٹنٹ

گورنر بنگال بہادر نے مزید دعائی ہزار کے نقد انعام کی سفارش کی (مراسلہ مسٹر A Eden

سکرٹری گورنمنٹ بنگال بنام کمشنر ٹیپنہ ڈویرن۔ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء)

سلسلہ دہائی ٹرائل: ص ۱۶۶

بعد یہ غریب اس گناہ پر تیار ہوئے ہوں گے! الغرض تو بہر حال لغزش ہے
مگر بعض ایسے موقعے آتے ہیں، کہ مجرم پر غصے کے بدلے رحم آتا ہے۔ یہی
حال راقم کا ان غریبوں کے ساتھ ہے۔ جانے۔ ان حالات میں ہم ہوتے،
تو کیا کرتے؟

ہاں! تو عرض یہ کر رہا تھا کہ گرفتار ان بلا ان مقدمات کے اشتہاری
مجرموں میں محدود نہیں۔ مثال کے طور پر مسعود خاں ساکن بوگرا (بنگال) کو
لیجئے۔ یہ ۱۸۶۱ء میں گرفتار ہوئے اور ۱۸۸۳ء میں مولانا عبید الرحمن
(ف ۱۳۱۲ھ) وغیرہ کے ساتھ رہا ہوئے۔ مگر ان کی گرفتاری اور
مقدمے کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

ان کے علاوہ ان سیکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہوں کے مصائب کا
اندازہ کرنے کے لئے، جو خلافت قانون جیلوں میں ڈال دیئے گئے تھے،

۱۳۹۵ھ آخر میں صرف چھ ملزم جزائر اندمان میں رہ گئے تھے۔ مولانا یحییٰ علی (ف ۱۳۸۴ھ) اور مولانا احمد اللہ

(ف ۱۳۹۵ھ) دونوں بھائی تو وہیں خواب سترحت میں مصروف ہیں۔ قاضی میاں جان انبالہ ہی میں

وفات پائے (۱۳۹۵ھ - ۱۳۸۳ھ) میں ملا رترین (۱۸۸۰ - ۱۸۸۴) وائسرائے ہند کے حکم سے جو لوگ رہا

ہو کر وطن لوٹے، ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) مولانا عبید الرحمن (متہم مقدمہ انبالہ: ف ۱۳۸۴ھ) (۲) مولوی

محمد حنفیہ قاسمی (متہم مقدمہ انبالہ: ف ۱۳۹۵ھ) (۳) میاں عبد الغفار (متہم مقدمہ انبالہ: ف تقریباً

۱۳۳۳ھ) (۴) مولوی امیر الدین (متہم مقدمہ مالہ: ف ۱۳۸۴ھ) (۵) مولوی تبارک علی (متہم مقدمہ

پٹنہ: ف تقریباً ۱۳۱۲ھ) (۶) مسعود خاں ساکن بوگرا (بنگال) (۷) امیر (۱۳۸۴ھ)

ہنٹر کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے :-

”اس وقت [یعنی ۱۸۴۷ء میں] بنگال جیل میں ایک سفید ریش مسلمان ہے۔ جس کی زندگی بہ طرح پاک ہے، لیکن وہ انتہا پسند باغی ہے تیس سال سے اس کی بغاوت کا حال معلوم تھا۔ اور وہ بھی جانتا تھا کہ اس کا حال چھپا ہوا نہیں۔ ۱۸۴۹ء میں اسے باضابطہ دھمکی دی گئی کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۴ء میں اس کا اعادہ کیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اسے مجسٹریٹ کی عدالت میں آخری طور پر نصیحت کے لئے بلایا گیا۔ اس نے ان تمام تنبیہوں کا ذرہ برابر خیال نہ کیا۔ آخر ۱۸۶۹ء میں وہ ذاتی حراست (Personal Restraint) میں رکھا گیا۔ ایسے مقدمات کو نبھانا بہت مشکل ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق متقی اور مخلص لوگوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے حکومت خود گھبراتی ہے۔ کم از کم یہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا زہر دوسروں تک نہ پہنچنے پائے۔ اور وہ بھی صرف معمولی پابندی کے ساتھ“

ایسی مثالیں اور بھی دی جاسکتی ہیں۔ پر جبکہ اور وقت کی تنگی قلم روکنے پر مجبور کرتی ہے۔

ساتواں باب

امیرانِ ہند کے مصائب و ان کی انتقامت

مجاہدین میں سے جو جامِ شہادت سے سیراب ہوئے، وہ دین و دنیا دونوں میں اچھے رہے۔ آخرت میں ان کے مرتبے کا حال تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؛ پر ایک دنیا دار کی مادی نگاہیں بھی اتنا دیکھتی ہیں کہ وہ ایک غیر الہی نظامِ حکومت کے ناخدا ترس عمال کے جو ر و ظلم سے بچ گئے۔ جہادِ سرحد کے شہید اول باقر علی عظیم آبادی سے لے کر ان لا تعداد اور گمنام شہیدوں تک

۱۔ دیکھو سیرت سید احمد شہید: صفحہ ۱۲۷، طبع دوم، بایہ حضرت سید شہید کے مرید اور مولانا ولایت علی صاوی پوری کے چچا زاد بھائی تھے سیرت سید احمد شہید، (صفحہ ۳۸۷) کے لائق مصنف نے سید صاحب کے خلفاء میں ان کا نام دیا ہے۔ خلافت کے متعلق تو قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا، البتہ آئندہ واقعہ ہے کہ یہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کے چچا زاد بھائی تھے اور مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی (ف ۱۲۷۴ھ) مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ) اور مولوی محمد الدین شہید (بالاکوٹ: ۱۲۷۶ھ) وغیرہم کے ہمراہ حضرت سید صاحب سے بیعت ہو چکے تھے۔ جب سرحد پر سکھوں سے جنگ شروع ہوئی، تو سب پہلے جو اللہ کا بندہ اس کی راہ میں کام آیا، وہ یہی باقر علی عظیم آبادی تھے۔ رحمہ اللہ و نور ضو عید۔

جو مختلف حملوں اور خونی معرکوں میں سفاک دشمن کے مشق ستم کا نشانہ بنے،
 سب نے اپنا اپنا حق ادا کیا۔ اور اللہ نے چاہا، تو وہ رضائے الہی سے سرفراز
 ہو چکے ہوں گے۔ مگر ان ہزاروں بے گناہوں کے غم و آلام کو بھی فراموش
 نہ کرنا چاہیے، جو طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہوئے۔ قسم قسم کی
 اذیتیں برداشت کیں۔ اور پھر آزماتِ مالش میں کامیاب اترے۔ یعنی
 ان کے قدم ہر منزل پر لغزش سے نا آشنا اور سینے نوں ایمان سے روشن
 رہے اور ان کے دل جذبہ فدویت سے کبھی خالی نہیں ہوئے۔ ان
 مجاہدینِ راہِ حق کی داستانِ درد بہت طویل ہے اور درد انگیز بھی۔
 قیدیوں اور جلاوطنوں کی رودادِ المِ سنا دی جائے گی۔ لیکن سچی بات
 تو یہ ہے کہ اب سننے سنالے کا وقت گزر چکا۔ وقت کی تیز رفتاری
 اپنے حال پر ہے۔ اس کی فطرت انتظار کرنا نہیں جانتی۔ موقعِ عمل کا
 ہے۔ وقت آگیا ہے۔ کہ پھر از سر نو اس رسمِ کہن کو زندہ کیا جائے۔
 عمریت کہ آوازِ منصوٰر کہن شد من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را
 مگر جب داستان چھڑ گئی ہے، تو پھر چند بکھرے ہوئے اور اوراقِ نذر
 ناظرین ہیں۔ خوش قسمتی سے اس راہ کے دو مسافر اپنی رودادِ سفر کا
 ایک حصہ ہماری عبرت و بصیرت کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ہماری مراد مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری کی تذکرہ
 صادقہ، اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی توارثِ عجیب سے ہے

سردست ہم انہیں کتابوں سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں، جس سے ان مصائب کی ہلکی سی جھلک معلوم ہوگی، جو ان شیفگانِ راہِ صداقت پر توڑے گئے۔ ان دونوں صاحبوں نے جزائرِ انڈمان سے واپسی (۱۸۸۳ء) کے بعد یہ کتابیں لکھی ہیں، اس لئے قدرتی طور پر وہ اپنے اصلی خیالات و تاثرات نہ ظاہر کر سکے ہوں گے۔ پھر بھی ضمنی طور پر ان بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نشانِ راہ کا پتہ لگتا ہے اور مجاہدین کی مصیبتوں کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔

مولانا یحییٰ علی، مولانا عبد الرحیم اور ان کے رفقا پہلے انبالہ جیل میں رکھے گئے، جہاں ان کا مقدمہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ وہاں ان کے ساتھ جو برتاؤ ہوا، وہ مولوی عبد الرحیم صاحب کی

س: ڈاکٹر محمد حسین خاں، لکچرر ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک مختصر مضمون ”ہندستانی وہابیوں کی سیاست“ (The Politics of the Indian Wahabis) مارننگ نیوز،

کلکتہ کے عید نمبر (۱۹۴۴ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے مولوی محمد جعفر صاحب تلغری کو ان لوگوں میں شمار کیا ہے، جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ”سید صاحب“ کو انگریزوں سے مطلق پریشانی نہیں تھی اور مسلمانوں کو اس حکومت سے کوئی شکایت نہیں۔ مولوی محمد جعفر صاحب اور مولوی عبد الرحیم صاحب، دونوں نے اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں، مگر ان کی کتابوں کا پڑھنے والا یہ محسوس کر لیتا ہے کہ فلاں بات کیوں کہی گئی ہے؟ اور ”بین السطور“ سے تو تمام باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسین خاں کی یہ رائے اس پس منظر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

”... ہر ایک علیحدہ علیحدہ ایک کو ٹھہری میں کہ جس کو سنگین کو ٹھہری کہتے ہیں، بند کر دیئے گئے۔ وہ کو ٹھہری پانچ فٹ لابی اور چار فٹ چوڑی ہو گی۔ اور چھت اس کی نہایت بلند اور اوپر چھت کے ایک چھوٹا سا روشندان تھا کہ آدمی اس میں سانس لے سکے۔ نہایت تنگ و تاریک تھی اس کو ٹھہری میں تقریباً ڈھائی تین مہینے ہم لوگ رہے۔ جملہ گیارہ آدمی تھے۔ شب و روز میں ایک بار اس کا دروازہ کھلتا اور ایک جمعہ دار اور تین سپاہی اور ان کے ساتھ ایک باورچی کہ جس کے ہاتھ میں روٹیاں اور دال ہوتیں اور ایک سقہ کہ جس کی مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی ہاتھ میں گملائے ہوئے آتا۔ اور ایک کو ٹھہری کو کھولتا۔ باورچی دور روٹیاں اور کچھ دال دے دیتا اور سقہ ایک کوزہ پانی دیتا اور بھنگی گملا صاف کر دیتا اور پھر یہ لوگ چلے جاتے۔ جو جو تکلیفیں اس میں گذریں، اس کا بیان طول ہے اور فضول۔ بعد تین مہینے کے جب مقدمہ ہم لوگوں کا اجلاس میں صاحب مجسٹریٹ کے شروع ہوا۔ اس وقت ہم گیارہ آدمی قبروں سے نکال کر ایک مکان حوالات میں جمع کر دیئے گئے، جو اسی جیل خانہ میں تھا۔ بعد تین مہینے کے ہم لوگوں نے آسمان کی صورت دیکھی اور ایک کی دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ از حد

آج کل تو قید خانوں میں سیاسی ملزموں کے لئے درجے مقرر ہیں
تیسرے درجے میں بھی سیاسی قیدیوں کے ساتھ حیوانوں کا برتاؤ نہیں کیا
جاتا۔ لیکن ان مجاہدین کو جیل میں پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں دیا جاتا۔
اللہ کے بندے انبالہ جیل میں گھاس پتوں پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوئے۔
”اس قدر بھوک کا غلبہ سب لوگوں کو رہتا کہ دو دو روٹیاں سرکار
سے ملتیں۔ ان کے کھانے سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ کھایا بھی ہے یا
نہیں؟ جیل میں جس قدر گھاس تھی، مع بیج اکھاڑ کر قیدی لوگ چٹ کر گئے
ہر طرف سے الجوع الجوع ہائے بھوک کا شور تھا۔

انبالہ میں سزایابی کے بعد اسیران بلا لاہور جیل کو منتقل کئے گئے۔
مگر کس شان سے؟ مولوی محمد جعفر صاحب لکھتے ہیں:-

۲۲ فروری ۱۸۷۵ء کو ہم جیل لاہور کو روانہ ہوئے۔ گہرا
لباس جو گیارہ صورت، کمبل اوڑھے ہوئے بیڑی ہتھکڑی کے زیور
سے آراستہ پیراستہ ہم منزل در منزل کو چ در کو چ چلے جاتے تھے۔
دو ایک گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بقدرتیں چالیس قیدیوں کے
ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تھے۔ سب پا پیادہ چلتے تھے جب
کوئی تھک جاتا، تو اس کو گاڑی پر بھی سوار کر لیتے تھے۔ ورنہ پا پیادہ
خلخال آہنی کوچھن چھناتے چلے جاتے۔۔۔“

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

لاہور پہنچ کر گرفتار ان الم کی مرصبتوں میں اور اضافہ ہو گیا:-
 ”قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازہ پر
 پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازہ جیل پر
 بٹھا دیئے گئے۔ اول ایک کشمیری ہندو واروغہ آیا۔ اس نے پہلے ہمارے
 مقدمے والوں کو بغور تمام دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد
 ڈاکٹر گری لے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے
 سب سے اول ہم لوگوں کو ملاحظہ کیا اور بڑے غصہ سے حکم دیا کہ ایک آڑا
 ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بھر دسدو اس حکم کے
 لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہو گئے۔ اور ہمارے دونوں پاؤں کے
 دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فنٹ سے
 زیادہ لمبا نہ تھا ڈال دیا گیا۔ یہ حکم ازراہ تعصب فقط ہم ہی لوگوں کے
 واسطے تھا اور تمام جیل گھر میں ہم نے کسی قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا
 نہیں دیکھا۔ چلنا۔ پھرنا، اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں
 پیار کر سونا بھی محال تھا۔“

یہ تو لاہور جیل کا عطیہ تھا۔ انڈمان جاتے ہوئے، ملتان اور کراچی
 کے درمیان ایک اور زنجیر کا اضافہ ہوا:-

”اور سوا بیڑی اور تھکڑی اور ڈنڈے کے، جو پہلے سے سب زیب تن

تھے، یہاں ایک بڑی موٹی زنجیر آہنی بھی ہماری بیڑیوں کے بیچ میں سے
پھنائی گئی تھی جس سے اپنی اپنی جگہ سے کوئی ہل [نہ] سکتا تھا۔ جب تک ہم
جہاز پر رہے، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔
اس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود اس
قدر کثرت پانی کے کہ دریائے سندھ ہمارے زیرِ پا تھا۔ ہم پڑے
پڑے تیم سے نماز پڑھتے تھے۔“

ان مظالم کے علاوہ مقدمہ کے دوران میں گرفتارانِ بلا اور ثابت قدم
گواہوں پر جو سختیاں کی گئیں، وہ بیان سے باہر ہیں۔ مثال کے طور پر
ایک دو واقعے لکھے جاتے ہیں:-

”... لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت بھی ہمارے منہ کو دیکھ کر زار
زار روتے بھی جاتے تھے مگر بے بس۔ اگر گواہی نہ دیوں، تو قطع نظر مار پیٹ
کے پھانسی کا سامنا تھا۔ اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام ایک
لوہ کا جودت تک میرے گھر میں رہ کر پرورش پایا تھا، جب مجھ پر ٹی میں
گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر مارے محبت کے جھوٹا اور آموختہ بیان
میرے اوپر کرنے سے ہچکچایا، تو اسی روز رات کو اس کو ایسی سخت سزا
دی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمہ سے قبل از وریشی مقدمہ کشن کے مر گیا۔“

یہ تو پیشی کے دوران کے مظالم تھے۔ مقدمے کی پیشی سے پہلے بعضے
بزرگوں پر جو تازہ مصیبتیں روا رکھی گئیں، ان کے سننے کے لئے پتھر کا کلیجہ
چاہئے۔ مولوی محمد جعفر صاحب اپنی آپ بیتی لکھتے ہیں۔ پڑھیے اور اپنا
ایمان تازہ کیجئے۔

”... دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب آئے اور مجھ سے
کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتلا دو۔ تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا....
پارسن صاحب نے مجھ کو پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا کبھی شروع کیا۔
جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا۔ اور جب اس قدر مار پڑی میں نے
کچھ نہ بتلایا۔ تو وہ سب کے سب مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ
کیفیت ظلم اور تعدی کی دیکھی، تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ
نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ روزے رمضان کے باقی تھے۔ دوسرے
دن سے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔ اس کے بعد پارسن صاحب انہیں
ڈپٹی کمشنر کے بیگلے پر لے گئے۔ اور وہاں فمائش سے مایوس ہو کر انھوں نے
اپنی آخری حسرت بھی نکال لینا چاہی۔“

”میں نے اس چاہلو سی پرکھی انکار کیا۔ تو پھر پارس صاحبہ مجھ کو ایک
الگ کمرے میں لے گئے۔ جہاں لے جا کر پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک
لکھوں؟ آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ
شاید کسی پر ہوئی ہو۔ لیکن بفضل الہی میں سب سہارا گیا۔ مگر اپنے رب سے

ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت امتحان کا ہے، تو مجھ کو ثابت قدم رکھیو۔۔۔“ (ص ۷)

یہ صبر آزمائیاں تھیں جن میں ان مردانِ خدا نے استقامت و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور یہی تکلیفیں تھیں جن سے گھبرا کر محمد شفیع، الہی بخش وغیرہ بعد کو سرکاری گواہ بن گئے۔ مگر ان سب میں ایک اللہ کا بندہ ایسا تھا، جو سب سے ممتاز تھا۔ اس کی استقامت میں صحابہ کرام کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس کی للہیت، جاں سپاری اور فدویتِ عبدیت کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی، جس کا تصور بھی اس دور میں مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

میری مراد مولانا یحییٰ علی جعفری صادق پوری سے ہے۔ یہ سید صاحب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے حالات پڑھ کر حضرت جنیب حسین بن علی (رضی اللہ عنہم) اور احمد بن حنبل (وف ۲۴۱ھ) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا، اپنے امیر مولانا ولایت علی (وف ۱۲۶۹ھ) کی معیت کبھی نہ چھوڑی۔ سفر، حضر میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ گلاب سنگی سے جواڑائیاں ہوئیں، ان میں بھی آپ شریک تھے۔ دوسری مرتبہ بھی سفرِ ماورائے سرحد میں آپ ساتھ رہے۔ پھر نظمِ جماعت کا کام آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ مولانا عنایت علی (وف ۱۲۷۴ھ) مولانا فرحت حسین (وف ۱۲۷۴ھ) اور شاہ محمد حسین صاحب (وف ۱۲۷۴ھ)

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

خلفائے سید شہید کے پے در پے وفات کی وجہ سے تنظیم تبلیغ کا سارا بار آپ کے کندھوں پر پڑ گیا، جسے آپ حیرت انگیز قابلیت اور معاملہ فہمی کے ساتھ اپنی گرفتاری کے وقت (۱۲۸۶ھ) تک چلاتے رہے۔ جیل اور قید میں بھی آپ کا رنگ سب سے الگ تھا۔ تکلیفیں اور رولز نے بھی برداشت کیں۔ پرحسین ابن علیؑ اور احمد بن حنبلؒ کا مقام ہی اور ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے احمد بن حنبلؒ ہمدانی بھی علیؑ کے صبر و استقامت کا حال سنئے:-

”ہمارے حضرت مولانا کا صبر و استقلال اس وقت کا قابل دید تھا۔ شرب کو میں اور آپ ایک ہی جگہ رہتے۔ آپ پچھلی شب حسب معمول نماز، دعا وغیرہ میں مشغول رہتے۔ اور اکثر اشعار عاشقانہ، دیوان شاہ نیاز و حافظ وغیرہ کا پڑھتے، اور ایک نہایت وجدی کیفیت آپ پر طاری ہوتی۔ ہم لوگ سب ہوش باختم ہوتے اور آپ نہایت مسرور و خوش۔ آپ کے چہرہ و بشرہ سے کچھ بھی آثار رنج و محن کے پائے نہیں جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ آپ اکثر اس شعر سے بھی جو حضرت جنیب صحابی رضی اللہ عنہ کا ہے، مترنم ہوتے:-

وَلَسْتُ أَبَا بِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلَيَّ شِقَاقَانِ فِي اللَّهِ مَصْرَعِي
وَذَلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلَهِ وَإِنْ يَشَاءُ يُبَارِكُ عَلَيَّ أَوْصَالُ شَلْوٍ مَمْرَعِي

[جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں، تو مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ اللہ کی راہ

میں کس پہلو میری جان نکلتی ہے۔ یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے

تو بوسیدہ (ٹکڑے ٹکڑے) جسم کے اعضا میں برکت اور بالیدگی دے [

میرے پاس ایسے الفاظ نہیں ہیں کہ جن سے آپ کی اس کیفیتِ جدی

وصبر و شکر کا ایک شمع بھی بیان کر سکوں اور اس کی تصویر کھینچ کر ہدیہ

ناظرین کرنا تو محال ہے۔“

ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ معمولی اس لحاظ سے کہ سب اسیرانِ بلا

صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر گئے۔ مگر ایک عاشقِ رسول (صلی اللہ

علیہ وسلم) پر اس کا کچھ اور ہی اثر ہوا۔ جب انبالہ میں پھانسی کی سزا

حبسِ دوام سے بدل دی گئی اور ان مشتاقانِ شہادت کو حکومت نے

بہ زعمِ خود شہادت سے ”محروم“ رکھنا چاہا تو ان کو عام قیدیوں کے

ساتھ کر دیا گیا اور لباس وغیرہ میں تبدیلی کے ساتھ دائڑھیاں بھی کہ دی

گئیں۔ اس کا مولانا پر جو اثر ہوا، اس کا حال سنئے اور سینوں پر ہاتھ

رکھ کر اپنے ایمان کا جائزہ لیجئے:-

”۱۶ ستمبر [۱۸۶۴ء] کو ڈپٹی کمشنر صاحب پھانسی گھروں میں

تشریف لائے۔ اور چیف کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو

بہت دوست رکھتے ہو، اور شہادت سمجھتے ہو۔ اس واسطے سرکارِ تمہاری

دل چاہتی سزا تم کو نہیں دیوے گی۔ تمہاری پھانسی مزائے دائم نہیں

۱۸ تذکرہ صادق منٹ

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

بعبور دریائے شور سے بدلی گئی۔ بجز دسنانے اس حکم کے پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں بلا دیا۔ اور جیل خانہ کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری داڑھی، مونچھ اور سر کے بال تراش کر منڈی بھیڑ سا بنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ مولوی کھٹی علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے کہ افسوس نہ کر کہ تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کے واسطے کتری گئی۔

مولانا کا صبر و استقلال ہر منزل اور ہر قدم پر یکساں تھا۔ پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔ قید تنہائی سے سرفراز ہیں۔ مگر سنت یوسفی سے غافل نہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے، اللہ کا پیغام پہنچانے سے باز نہیں آتے۔

”... چنانچہ ہمارے حضرت اس قید تنہائی میں پھر کھینا دو ڈھائی مہینے رہے اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ان ایام کو آپ نے بسر کیا اور جب کوئی سپاہی پرے والا یا اور کوئی سپاہی یا قیدی آپ کے سامنے آتا۔ ہندو یا مسلمان، سب کو آپ توحید باری کا وعظ سناتے اور عذاب آخرت و قبر و غیرہ سے ڈراتے۔ سپاہی جو پرے کے واسطے آتا وہ سکھ ہوتا یا لہو رکھا اور مسلمان نہ ہوتا [تو] آپ اس آیت کریمہ کا وعظ سناتے۔

”ارباب منفرقون خیرا ام اللہ الواحد القہار“۔ سپاہی کھڑا رہتا اور جب اس کے پرے کی بدلی ہوتی، تو اس صحبت کو

یہ قانع عجیب تھا کہ یوسفؑ متفرق معبودا چھے یا الیک عبید برحق جو سب زبردست ہے وہ اچھا

چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا۔ میں کچھ نہیں لکھ سکتا کہ کس قدر فائدہ اس وقت
پہرے والوں کو پہنچا اور کتنے موحد ہو گئے۔ اور کتنے دین آباؤی کو چھوڑ کر
مسلمان ہو گئے۔ لا یعلمہ الا اللہ... آپ کا جسم مبارک قیدی
تھا، مگر آپ کے دل و زبان آزاد تھے۔ اس پرپی کی حکومت دیکھی بجز اس
حاکم حقیقی کے۔ اگر دو منٹ کے واسطے بھی کوئی آدمی سامنے آ جاتا،
آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بجالاتے۔

ابھی آپ داڑھی کتروانے کا حال پڑھ چکے ہیں۔ اب تشدد اور
مشقت پر بھی ذرا اس "مرد مومن" کی استقامت کا حال سنئے :-
"صبح کو کپتان ٹائی صاحب مجسٹریٹ و ڈپٹی کمشنر انبالہ و پارسن
صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس جیل میں آئے۔ اور داروغہ کو حکم دیا کہ مولانا
سے سخت تر مشقت لی جاوے۔ چنانچہ خود اس نے اپنے روبرو کھڑے
ہو کر ایک بڑے کنویں پر جو رہٹ چل رہا تھا، عین تہارت آفتاب میں
اس رہٹ کو آٹھ دس قیدی چلا رہے تھے۔ آپ کو بھی اس میں دیدیا۔
آپ دو تین روز تک تمام روز اس کو چلاتے رہے۔ آپ کو بیاعث
حرارت آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا۔ آفتاب خون کا پیشاب آنے لگا۔
آپ نہایت صبر و شکر سے اس کو انجام دیتے رہے۔"۔۔۔
بعد میں جب جیل کا ڈاکٹر آیا، تو اس نے داروغہ جیل کو از خود تنبیہ کی

اور مولانا کو ایک دوسرے ہلکے کام پر لگایا گیا۔

اس کے بعد امتحان کا ایک دوسرا موقع آتا ہے۔ حکومت مولانا بھائی علی کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ (ف درانڈمان ۱۲۹۶ھ) پر مقدمہ چاٹنا چاہتی ہے۔ انبالہ کے سزا یافتہوں کو طرح طرح سے ورغلا یا جبار ہا ہے۔ محمد شفیع، عبدالکریم اور الہی بخش کے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ طرح طرح کی ترغیبیں دی جا رہی ہیں۔

”... وہ عجیب وقت تھا کہ ادھر تو ہم لوگ انواع قسم کے آلام و مصائب میں مبتلا اور پھر عذاب الجوع، اور ادھر وہ راحت و آرام و تنعم، گویا نمونہ قیامت تھا کہ ایک طرف جنت اور دوسری طرف دوزخ نظروں کے سامنے رکھی تھی۔ وہ وقت پر لے سرے کی جانچ اور امتحان کا تھا۔ اس وقت پر آئیہ کریمہ و زلز لو ازلزلا شدیدا کا مضمون خوب صادق آتا ہے۔ ہر ذی ایمان رب سَلِّمْ سَلِّمْ کُنَّا تَقَا۔ ہمارے حضرت باطنیان قلب نہایت خداں و شاداں و فرماں یاد الہی میں اور لوگوں کو استقامت دلانے میں شب و روز مصروف رہتے۔ دنیا ئے دوزخ کی بے ثباتی اور اس کے راحت و آرام کی بے قراری اور ثواب آخرت اور جنت نعیم کی پابنداری یاد دلاتے اور رضوانِ مِنَ اللہ اکبر کو خوب کھول کر فرماتے رہے۔“

داستان طویل ہوتی جاتی ہے۔ اور سخنہائے گفتنی کی کوئی حد نہیں۔
خام کار قلم حیران ہے، کیا چھوڑے اور کیا لکھے؟ ... بہر حال مولانا کے کھبر
شکر کی ایک اور مثال پیش کر کے یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں۔

۱۸۶۵ء میں جب صادق پور کے مسکونہ مکانات اور قبریں
کھود کر پھینک دی گئیں، تو اس وقت اچھوں اچھوں کے قائم لڑکھڑائے
تھے اور اسیرانِ بلا کے لئے بھی صبر و ضبط کا قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔
مولانا یحییٰ علیؒ کو اس حادثے کی خبر وہیں جزائرِ انڈمان میں ملتی ہے۔ اور
صبر و شکر کے ساتھ اپنی اہلیہ اور اہل خاندان کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے
ہیں۔ مولانا کے مکتوب کے اقتباسات پڑھئے۔ اور کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر
سوچئے کہ ایسے میں ہمارا کیا حال ہوتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

”یحییٰ علیؒ کی طرف سے بخدمتِ حبیبہ ام محمد یوسف سلمہ اللہ تعالیٰ۔
..... ضروری لکھنا یہ ہے کہ خط سے نور چشم محمد حسنؒ مد عمرہ کے حالِ انہدام
دونوں مکانوں کا معلوم ہوا۔ البتہ دل کو قلق ہوا اور صدمہ بہت گذرا،
کیونکہ مکان سکونتِ قدیم سے خصوصاً وہ مکان کہ جس میں ذکر اللہ بہت ہوا
ہوا اور ”کاروبار“ فریضہ بہت اجرا پائے ہوئے، مومنین کو انس و محبت بطور

۱ شمس العلماء مولانا محمد یوسف صاحب رنجورہ ایم بادی (ف ۱۳۴۱ھ) خلف مولانا یحییٰ علیؒ۔

۲ شمس العلماء محمد حسن صاحب ذبیح (ف ۱۳۴۱ھ) خلف مولانا ولایت علیؒ (ف ۱۳۶۹ھ)۔

اہل و عیال کے ہوتی ہے۔ اسی روز شب کو زیارت روح النور سے
 حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرف ہوا، تبسم کنان فرمائی گئی
 کہ البتہ انہدام سے مکانوں کے مالکان مکان کو خصوصاً انہدام کو
 نوح و الم بہت ہوا ہے اور ہونے کی جگہ ہے اور ان آیات کریمہ کو زبان
 مبارک سے ارشاد فرمایا۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ
 مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ
 عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ
 هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَقَّنَا مُسْلِمِينَ ۝
 عَسَىٰ رَبَّنَا أَن يَبْدِلَ لَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا رَاغِبُونَ ۝
 اور فرمایا کہ ان آیات کریمہ کو روز زبان رکھو۔ عبادت خانے اور مسجد اقصیٰ
 اور مکانات انبیاء علیہم السلام نجات نصرا اور جالوت کے ہاتھ سے انہدام
 پائے تھے۔ آخر منہدم کرنے والے نسیانیا ہوئے اور یہ اماکن متبرکہ از سر نو

۱۵۲-۱۵۱۔ پھر جو لوگ ایسے ہیں کہ صبر کرنے والے ہیں، تو انہیں (صحیح و کامرانی کی) بشارت

دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی کوئی مصیبت ان پر آ پڑتی ہے تو ان کی زبان حال کی صدا یہ ہوتی ہے
 کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے الطاف و
 کرم ہیں اور جو اس کی رحمت کا مورد ہوتے ہیں اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

(ترجمان القرآن)

۱۔ ہمارے پروردگار، ہمیں صبر کی نعمت سے شاد کام فرما اور ہمیں سلام کی حالت میں اس دنیا سے
 اٹھا۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس کا اچھا بدلہ دے ہم اپنے پروردگار کی طرف جمع کرنے والے ہیں۔

بنا ہوئے اور پہلے سے زیادہ آباد ہوئے۔ تم بھی اپنے رب کے فضل سے ایسا ہی امید رکھو۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دشمنانِ خدا ان کے دوستوں کو اچھی طرح ستالیں۔ بعد اس کے اچھی طرح بدلہ پاویں۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔“

بعد از فراغ اس مکاشفہ میں نے بہت انشراح و تسکین پایا۔ اور اپنے بڑے بھائی [مولانا احمد اللہ رح] کو آگاہ کیا۔ ۷

دریائے عشق خالقِ دونوں جہاں میں ہم
نام و نشان دار فنا کے ڈوب چکے
کفنی گلے میں ڈال کے ہتم کر کے بیچ
ہم جو گئی ہوئے محرم اسرار کے لئے
اے خدائے من فدایت جانِ من
جملہ فرزندِ ان خان و مانِ من۔ الخ

اقتباس از مکتوب میر خضر علی حیدری الاولیٰ

روز یک شنبہ [۱۲۸۳ھ] ۱۸۶۶ء

آٹھواں باب

ظاہری ناکامی کے سبب

کامیابی ناکامی؟ سید شہیدؒ، ان کے اصحاب خاص اور ان کی جماعت کے کارنامے پڑھ کر ذہن میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ یہ تحریک ناکام کیوں ہوئی؟ اور جب ایسی جماعت جو اپنی سیرت اور کردار کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار کا نمونہ تھی، ناکام رہی، تو پھر کسی دوسری جماعت کی کامیابی اور منزل مقصود تک پہنچنے کا کیا امکان ہے؟ یہ سوال پیدا ہونا طبعی بات ہے۔ اور اقم سے اچھے اچھے اصحاب علم نے یہ سوال کیا ہے کہ سید صاحبؒ اور مولانا شہیدؒ کی ناکامی کے بعد اس راہ پر قدم بڑھانے کی جرأت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ حکومت علیٰ منہاج النبوة کا نام لینا آسان ہے، مگر کرنا مشکل؛ انھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ اب اللہ کی سر زمین پر اس کا نام سر بلند ہو ہی نہیں سکتا۔ اب لے و سٹہ یہ فرضی اقوال نہیں، بلکہ اسلامی ہند کے ممتاز ترین شخصیتوں کی ہیں، میں نام لینا مناسب اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

اسلام کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ کسی دوسری چلتی ہوئی تحریک کا ضمیمہ بن کر رہے۔ ناکامی کے اسی غیر اسلامی تصور نے ہمارے بعض مشہور اہل فکر کو مسلمانوں کی تقدیر (Destiny) ہی سے مایوس کر دیا ہے۔ بعض دلوں میں مایوسی تجربہ اور استقراء کا چولا بدل کر کہتی ہے کہ یہ قوم اب عظیم ہو چکی ہے۔

ایک خطا کار اور نا آشنائے راہ و رسم منزل، جب بزرگوں کی زبان سے یہ باتیں سنتا ہے، تو حیرت ہوتی ہے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق صورت حال کے سمجھنے اور اس پیچیدہ گفتنی کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری کامیابی اور ناکامی کا تصور دنیا کے عام تصورات سے بالکل الگ ہے۔ ہم اس خاکدانِ ارضی میں 'عبد' بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے آقا اور مولا کی رضا مندی، اس کے احکام کی بجا آوری اور اس کا کلمہ بلند کرنے کی کوشش میں لگے رہیں۔ مقصود کو پالینا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام کوشش کرنا اور ذہنی و جسمانی قوتوں کو حرکت میں لاتے رہنا ہے۔ منزل تک پہنچانا اس کا کام ہے، جس نے ہمیں اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے دنیا میں غلام بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے ایک مومن قانت کے دل میں دنیوی کامیابی و ناکامی کا سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے مولا کی رضا میں لگے رہنا سو کامیابیوں کی ایک کامیابی ہے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

(ii) دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ کیا یہ تحریک بالکل ناکام رہی؟ کیا شاہ ولی اللہ (ف س ل لہ) اور ان سے پہلے اسلامی ہند کی جو دینی حالت تھی، اس میں "شہیدین" اور ان کے اصحاب با صفا کی کوششیں اور فداکاریوں سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ کیا آج بھی بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی اسی طرح معیوب و مذموم سمجھا جاتا ہے؟ کیا آج بھی بڑے بڑے علمی خاندانوں اور علمائے دین کے گھروں میں "السلام علیکم" کے بدلے "آداب عرض کرتا ہے" کی صدا بلند ہوتی ہے؟ کیا آج خواص اور اہل علم عمل طبقوں میں اجمیر اور دیوہ کی زیارت حج کے برابر سمجھی جاتی ہے؟ اور کیا سو ڈیڑھ سو برس سے آج تک مسلسل مردان کار کا ایک گروہ (خداہ کتنا ہی مختصر سی) اللہ کے نام پر گھر بار لٹاتا نہیں رہا ہے؟ کیا آج بھی شرک و بدعات کی گرم بازاری کا وہی حال ہے؟ اور کیا "شہیدین" سے پہلے بھی بر ملا طریقے پر حکومت الہیہ اور خلافت علی منہاج النبوت کی صدا اٹے عام سننے میں آتی تھی؟ اگر ان سب کا جواب اثبات میں ہے، تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ناکامی کسے کہتے ہیں؟ اور اگر اس کا نام "ناکامی" ہے، تو ایسی "ناکامی" پر ہماری ہزاروں کامیابیاں قربان — کہنا یہ ہے کہ حضرت سید شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کے اصحاب خاص کی تحریک دعوت و جہاد سے "بکر ہند" کی ساکن سطح میں جو تہوج پیدا ہوا ہے، اس کی لہریں آج تک باقی ہیں اور "بزم آریاں" ساحل کو دریا

کی موجوں سے ہم آغوش ہونے کی برابر دعوت دے رہی ہیں۔ اگر اس تحریک سے ہزاروں فیوض و برکات کے علاوہ صرف یہی ایک فائدہ ہوا ہوتا، تو بھی اسے ناکام نہیں کہا جاسکتا۔ ورنہ یہاں تو یہ حال ہے کہ موجودہ اسلامی زندگی کے جتنے روشن اور خوش منظر گوشے نظر آتے ہیں، سب کے سب اسی تحریک کے فیض سے مستفیض اور اسی کی روشنی سے اجاگر ہوئے ہیں۔

(iii) لیکن ہمیں اسی قدر پر قناعت نہیں کرنا ہے، بلکہ کمر ہمت کو چست باندھ کر محل کو آگے بڑھانا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی ظاہری اور دنیوی کامیابی کی راہ میں جو دشواریاں رکاوٹ ثابت ہوں، ان سے دامن بچا کر سفر شروع کیا جائے۔ نیز اس تحریک کے علم برداروں سے جو مسامحتیں یا فروگزاشتیں ہوئی ہوں ان کا جائزہ لیا جائے اور آنے والوں یا ساتھ کے چلنے والوں کو ان سے آگاہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے، اس سے خوش عقیدہ لوگوں کو کچھ تکلیف بھی ہو، لیکن اگر اس ساری داستان سرائی سے مقصود محض پیرم سلطان بود کا آموختہ پڑھنا نہیں ہے، تو پھر مستقبل کی کامیابی کے لئے ماضی کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا بے لاگ جائزہ لینا ضروری ہے۔

(الف) سب سے پہلی چیز جو سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے جس علاقے۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

(ہندستان کا سرحدی صوبہ اور ماورائے سرحد کا علاقہ) کو اپنا میدان عمل اور سرگرمیوں کا مرکز بنایا، وہاں کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کا انھوں نے پیشتر سے کوئی انتظام نہیں کیا۔ فوری تبلیغ و ترغیب سے بعض قبیلے ہم نوا ہوئے، مگر جو نہی موقع ملا، دھوکہ دینے میں انھیں ذرا بھی جھجک نہیں پیدا ہوئی۔ اور جب فتح پشاور کے بعد اسلامی قانون نافذ کیا گیا، تو ان کی قبائلی عصبیت اور رچی بسی ہوئی جاہلیت بھڑک اٹھی۔ جس کے نتیجے میں مجاہدین کا قتل عام ہوا اور جلتی ہوئی لڑائی شکست سے بدل گئی۔ قانون اسلامی کے نفاذ کے لئے مسلمان رعایا بھی مطلوب ہے۔ فاشستی یا ناستی آمریت کے نمونے پر الہی قانون پر عمل درآمد نہیں کرایا جاسکتا۔ اس کے لئے رعایا اور عام آبادی کی طرف سے تعاون اور لپک شرط ہے۔ مزید براں یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے کہ اسلامی حکومت کی رعایا ایک دن میں نہیں بنتی۔ اس کے لئے مدت دراز تک دعوت و تبلیغ اور اس سلسلے میں اذیتوں کا برداشت کرنا ناگزیر ہے۔ خود حضور الہی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس تدریج کا مکمل نمونہ موجود ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ پشاور کے قتل عام اور خواتین کی غارتگی کے بعد بھی مجاہدین کو اپنی اس غلطی کا احساس نہیں ہوا اور وہ سالہا سال تک اسی علاقے کو اپنی فداکاریوں کا مرکز بناتے رہے، حالانکہ انھیں ہر دور میں اور ہر لڑائی میں قبائل نے دھوکے دیئے۔ مولانا غنایت الدین رحمہ اللہ ص ۵۲

(ف ۱۸۵۶ء) مولانا عبد اللہ (ف ۱۳۲۲ھ) ہر ایک کو اس قسم کے دھچکے لگتے رہے، مگر انہوں نے ان علاقوں کو نہ چھوڑا اور نہ ان قبائل کی باضابطہ اسلامی تربیت کی طرف توجہ کی۔ بہت ممکن ہے کہ مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کے بعد اسلامی انقلاب کا صحیح تصور بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

قبائل کی مسلسل غداروں کے باوجود ان علاقوں میں مجاہدین عربین کے جمع رہنے کی ایک وجہ اور سمجھ میں آتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مقدمہ سازش انبالہ (۱۲۶۳ھ) تک اہل صادق پور، اصحاب قافلہ (لوناک) اور عام مجاہدین و معتقدین پر سید صاحب کی شہادت کا مسئلہ واضح نہیں ہوا تھا اور وہ شمالی مغربی پہاڑیوں سے سید شہید کے دوبارہ ظہور کی توقع رکھتے تھے۔ ممکن ہے، خوانین و قبائل کی غداروں کے باوجود ان پہاڑی علاقوں میں جمع رہنے پر اس خیال کا بھی دخل ہو۔ یہ راقم کی ذاتی رائے ہے، جس پر اصرار نہیں۔

(ب) دوسری اہم چیز جو اس دعوت اور اس کے ماننے والوں کی سیرت میں کھٹکتی ہے، وہ ان کا امیر کی ذات میں غلو ہے۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ مولانا اسماعیل شہید جیسے عالم اور مجاہد بھی حضرت سید شہید کے متعلق ایسے القاب استعمال کرتے تھے جو ان کے بے شمار کفیل عام کے بعد سید مختار کو چھوڑ کر راج دھاری میں چلے گئے اور خوانین کے اظہار شہادت کے باوجود اس مرکز سے کنارہ کشی اختیار کر لی جہاں چار سال صرف کچھ تھے لیکن یہ تمام علاقہ کم و بیش یکساں تقاضا و خواہش کی کوئی تربیت نہیں جہاں غریبوں کی جوش یا مال غنیمت اور دنیوی جاہ و چشم کی طمع میں وہ ساتھ دیا کرتے تھے۔

ملاحظہ ہو دیباچہ صراطِ مستقیم۔ اما بعدی گوید... بندہ ضعیف محمد معصیل کہ نعم الہی در بارہ این ضعیف نامناہی است و از اعظم آن حضور و نفل ہدایت منزل ملازمان فخر فائدان سیاد (بقیہ ملاحظہ فرمائیں ص ۲۰۶ پر)

کرتے ہیں، کہ پڑھ کر خیال ہوتا ہے، کہیں کسی معصوم کی توصیف تو نہیں بیان کی جا رہی ہے؟ ”شخصیت میں غلو کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد ہی ”غیبوت“ کا شاخسانہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس میں بڑے بڑے عالموں اور مجاہدوں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ مولانا ولایت علیؒ، مولانا یحییٰ علیؒ اور بیسیوں تابع سنت عالم اس عقیدے کے قائل ہو گئے تھے۔ مولانا یحییٰ علیؒ (جہا پنی استقامت اور عمل کے لحاظ سے امام احمد بن حنبلؒ کا نمونہ تھے) غالباً آخر تک سید صاحبؒ کی غیبوت کے قائل رہے مشہور ہے، کہ پھانسی گھر میں وہ درود کے یہ شعر بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتے تھے :-

اتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کو ئے یار میں گزے
کون سی رات آپ آئیں گے دن بہت انتظار میں گزے
نیزان کے اس تاریخی مکتوب میں جو انھوں نے جزائر اندامان سے
مکانات مسکونہ کے انہدام کی خبر سن کر لکھا تھا (جس کا ایک ٹکڑا اوپر درج
کیا جا چکا ہے) یہ فقرے بھی ملتے ہیں :-

”.... زیارت ارواح متبرکہ سے حضرت علی مرتضیٰ حسنین رضی اللہ عنہم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵) مرجع ارباب ہدایت مرکز دائرہ ولایت دلیل سبیل فلاح و رشاد، رہنمائے طریق
استقامت و سداد و منظر انوار نبوی، منبع آثار مصطفوی، سلالہ خاندان صلب طاہر۔ بمقتدائے صحاب
شرعیہ، پیشواۓ ارباب طریقت، ہادی زمانہ مرشد یگانہ، سراج المجہبین، تاج المجہوبین الامام الاولیٰ و ولی
احمد متبع اللہ المسلمین بطول بقایہ و نفعنا و سائر الطالبین باقرہ الہ و احوالہ الخ۔

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک
 ۲۰۶
 میں مشرف ہوا۔ حضرات ثلاثہ کو بہت منور دیکھا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا
 کہ میرا شمار اللہ خاں کو کہدو کہ تو بھی میرا زاد ہوتا ہے۔ اور ہمدی جو واسطے
 ادفاع منافقین ملاعنہ کے کوہستان، خراسان میں موجود ہے۔ عنقریب نکلے گا
 اور قلع قمع منافقین ملاعنہ کا کرے گا۔

مولوی جعفر صاحب تھانیسری کی سوانح احمدی، کے دیباچے میں
 بھی ہمدی وسط کا لفظ آتا ہے، گو ذرا احتیاط کے ساتھ۔ رسالہ اربعین
 فی المہدیین بھی اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ خواہ مخواہ ذہن سید صاحب
 کی ہمدویت کی طرف منتقل ہو۔

یہ سب غلو اور حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کا نتیجہ تھا۔ اسلام میں
 حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کی ذات معصوم نہیں۔ امام
 دارالہجرۃ سیدنا مالک بن انس (رحمۃ اللہ علیہ) نے سچ کہا ہے:-

کَلَّا أَحَدُیُؤْخِذُ مِنْهُ وَیُرِیْهِ عَلَیْہِ الْاَکَلُ
 رَسُوْلُ الْاَکْرَمِ صَلِی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ
 صَاحِبُ ہٰذَا الْقَبْرِ صَلِی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمُ
 اقوال میں رد و قبول کی گنجائش ہے۔

(ج) تیسری نمایاں چیز جو اس پہلی اسلامی تحریک کے علم برداروں
 میں کھٹکتی ہے، وہ ان کا متصوفانہ انداز بیان اور طریق عمل ہے۔ حاشاکہ
 راقم کو تصوف کی روح اور جوہر سے انکار نہیں۔ اور حضرت مجدد الف ثانی
 (رحمۃ اللہ علیہ) اور شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) جیسے بزرگوں
 نے تصوف، کے نام سے جو چیز پیش کی، گو وہ اپنی روح اور جوہر کے لحاظ سے

اسلامی احسان سے الگ نہیں تھی لیکن انہوں نے انہماک طلبہ کے لئے جو زبان اور اصطلاح اختیار کی وہ وہی تھی جس کے ذریعہ عرصہ دراز سے تصوف باطل کی ترویج ہو رہی تھی۔ حضرت مجددؒ نے تو ابن عربیؒ (ف ۷۳۰ھ) کے گمراہ کن نظریوں پر سخت ضرب بھی لگائی، مگر شاہ صاحبؒ نے مجددؒ صاحبؒ اور ابن عربیؒ کے نظریوں کے درمیان تطبیق دے کر عقیدہ وحدت الوجود کو سنجہ از عطا کر دی۔ حضرت سید شہیدؒ کے رفیق خاص مولانا شہیدؒ نے البتہ امام ابن قیمؒ (ف ۷۵۰ھ) کی طرح ٹھیسٹھ توحیدی طریقہ اختیار کیا۔ عبققات میں تو وہ اپنے دادا کے رنگ پر معلوم ہوتے ہیں۔ مگر صراط مستقیم میں سید صاحبؒ کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ وحدت الوجود سے بیزار نظر آتے ہیں۔ مگر خود سید صاحبؒ کی ذات کے ساتھ کرامات اور خرق عادات اور مکاشفات کا اتنا بڑا سلسلہ وابستہ کر دیا گیا، کہ شہیدینؒ کی شہادت کے بعد ہی یہ جماعت اندھی عقیدت کا شکار ہو گئی۔ کچھ تو عقیدہ غیبیت کے قائل ہو گئے اور گاہے گاہے انھیں سید صاحبؒ کا سلام بھی پہنچنے لگا اور پیری مریدی سے تو بہت کم لوگ بچ سکے۔ بدعات سے نفرت، اہل حدیثیت اور جذبہ جہاد کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مراقبہ ہوتا۔ ”توجہ“ دی جاتی۔ ”مکاشفات“ بیان کئے جاتے اور ”کشف قبور“ وغیرہ میں مہارت پیدا

۱۵ مولانا عبدالرحیم صاحب (ف ۱۳۱۰ھ) مولانا یحییٰ علی (ف ۱۳۱۰ھ) کے حال میں لکھتے ہیں: ”فیض باطنی بھی علی وجہ الاتم آپ نے پایا۔ آپ کے مراقبے کی (بقیہ صفحہ ۲۰۹ پر)“

کی جاتی۔ نتیجہ معلوم۔ متبعین ہندت اور مجاہدوں کے ماننے والوں میں بھی
 ”بہ مے سجادہ رنگیں کن، گرت پیر مغال، گوید“ کا انداز پیدا ہو گیا۔ تمام
 اسلامی دنیا اور خاص کر ہندستان میں تصوف کے موجودہ قالب نے دین
 اور دینی تحریکوں کو اتنا نقصان پہنچایا ہے، کہ اب صرف اس لئے بھی یہ قالب
 قابل ترک ہو گیا ہے۔ تورع، زہد، عبادات، تہجد، گزاری، اللہ کی یاد۔
 کسی چیز سے انکار نہیں، یہ چیزیں محمود تھیں، اور ہمیشہ محمود رہیں گی۔ مگر
 پیری، مریدی کا یہ غیر ماثور طریقہ اب قطعی طور پر قابل ترک ہو گیا ہے۔ اور یہ طریقہ،
 تو ترکیہ کے ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب یہ چیز واضح ہو چکی کہ یہ طریقہ
 اپنے مقصد میں کامیاب نہیں، تو پھر اس کے ترک کرنے میں کون سی چیز
 مانع ہے؟

(د) ایک آخری بات اس باب میں اور قابل غور ہے۔ سید شہیدؒ

(بقیہ ماثر صفحہ ۲۰۸) یہ کیفیت تھی کہ جب بھی آپ چادر اوڑھ کر بیٹھ جاتے، فی الفور آپ کو
 مراقبہ کھل جاتا۔ انبیاء و اولیاء کی زیارت ہوتی۔ ان سے گفتگو ہوتی۔ ان سے حل مطالب
 فرماتے۔ کشف قبور میں بھی آپ کو ملکہ تام تھا۔۔۔۔۔“ (تذکرہ صادقہ: ص ۳۷)

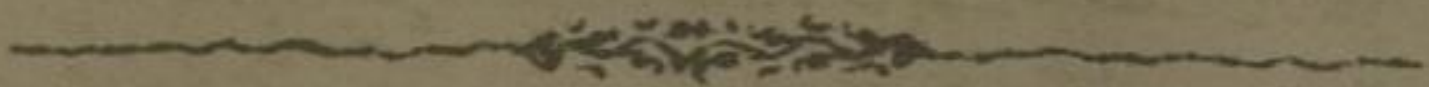
پھر دہریہ لگا اپنے والد ماجد مولانا فرحت حسین (فت ۱۳۷۷ھ) کے مال میں غمخوار ہیں۔۔۔۔۔
 ”جناب مولانا یحییٰ علی علیہ الرحمۃ کو جب کہ آپ ملک افغانستان میں تھے، بعد انتقال بڑے حضرت کے
 (مولانا ولایت علی:۔۔۔۔۔) مراقبہ میں مشاہدہ بازی و زیارت انبیاء و اولیاء بزرگان دین
 بند ہو گیا۔ جب آپ وہاں سے پٹنہ تشریف لائے، جناب چھوٹے حضرت نے ان کو بٹھا کر لوجہ دی،
 تب مراقبہ میں مشاہدہ و زیارت وغیرہ سب دستور جاری ہو گیا (ص ۳۷)

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

اور ان کے اصحاب خاص نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ اور ان کا طریقہ کار اس زمانے کے لحاظ سے ایک حد تک ٹھیک بھی تھا، مگر اب کہ حالات بدل چکے ہیں، لکیر کا فقیر بنار ہونا مناسب نہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت سے نئے حالات اور نئے مقتضیات کے مطابق مکمل اسلامی انقلاب و تجدید کا خاکہ بنا کر گامزن ہونا چاہیئے۔ اب صرف قتال یا صرف عبادت و زہد کی روح کا بیدار کرنا کافی نہیں۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں جاہلیت کے مقابلے کی تیاری کرنا چاہیئے۔ آج کفر کے حملے کسی ایک مورچے پر محدود نہیں۔ ہر آنے والی سانس کفر کے جراثیم سینوں میں داخل کر رہی ہے۔ فضا آلودہ اور زہریلی گیسوں سے مسموم ہے۔ اس کے مقابلے کے لئے مکمل اور ہر جہتی پروگرام کی ضرورت ہے۔ نمرود کی آگ آج ہر کوچہ و بازار میں بھڑک رہی ہے۔ لیکن اولاد ابراہیمؑ کو شاید اس کی خبر بھی نہیں۔ طاغوتی قوتوں کا ہرچم کوہ و دشت، ویرانہ اور آبادی، ہر جگہ لہرا رہا ہے۔ کون ہے، اللہ کا بندہ جو بڑھ کر حق، اور ایمان باللہ کا علم بلند کرے؟

— ہر طرف سے ہل من مبارک؟ ہل من عجیب؟ کی

گونج سنائی دیتی ہے۔ کون ہے، جو لبیک کہے؟



کتابیات

فارسی (۱)

- (۱) صراطِ مستقیم - مولانا اسماعیل شہید (ش ۱۲۶۶ھ)
- (۲) اجازت نامے - صادق پور سے سید صاحب کے بعض ایسے اجازت نامے دستاویز ہوئے، جو اب تک کہیں طبع نہیں ہوئے، اور جن سے سید شہید کی تعلیم اور طریق تزکیہ خاصی روشنی پڑتی ہے۔
- (۳) مخزن احمدی (قلمی) مصنفہ مولوی سید محمد علی صاحب (ف ۱۲۶۶ھ)
- خواہر زادہ و خلیفہ حضرت سید شہید (مخطوطہ اور نیٹل پبلک لائبریری، ٹینہ: ۱۳۸۵)
- (۴) حالات مولوی غنایت علی یا اعلام نامہ (قلمی) یہ ایک اہل ہے، جو مجاہدین مقیم سرحد نے مسلمانان ہند کے نام بطحی تھی، مورخہ ۱۳۱۵ھ میں کاتب کا نام امام علی درج ہے (مخطوطہ کتاب خانہ آصفیہ، حیدرآباد)
- (۵) آحاف النبلاء:- نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۱۵ھ) - مؤرخ فقہاء کے تذکرے میں شہید کا کتاب ہے۔ اس میں مولانا شہید اور اس سلسلے کے بعض دوسرے حضرات کے حالات بھی درج ہیں۔
- (۶) نقوی شہر آشوب:- حکیم عبدالحمید عظیم آبادی (ف ۱۳۱۵ھ)
- (۷) الاقتصاد فی مسائل الجہاد:- مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب بنیالوی

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

(ف ۱۳۳۸ھ) اس رسالے میں ہمد کو منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
مطبوعہ ۱۳۰۶ھ - اردو، انگریزی عربی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے
اور انگریزی اور اردو ترجمے سر چارلس ایم کیسین اور سر جیمس لائل گورنر ان پنجاب کے
نام معنون کئے گئے۔

اس کی تالیف ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ علماء عصر سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں
رسالہ اشاعت السنہ میں شائع کیا گیا (جلد ۲، ضمیمہ) پھر مزید مشورہ و
تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں اس کی اشاعت ہوئی
اللہ رحمہ کی مغفرت کرے۔ اس کتاب پر انعام سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ عجات
اہل حدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے۔ اور یہ ہی وہ بزرگ ہیں،
جنہوں نے اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی خوب پیداکی۔ نہ صرف یہ، بلکہ
دوسرے معاصر علماء کو سرکار کی مخالفت کے طعنے بھی دیئے۔

اردو (۲)

رسائل تسعہ :- از مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) اسی مجموعے میں رسالہ
دعوت اور رسالہ الرعین بھی ہیں۔ رسالہ دعوت میں صاف صاف عقیدہ غیبت کا
اظہار ہے۔ اور رسالہ الرعین میں خروج مہدی کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کر دی گئی ہیں۔
مگر یہ صاحب کا نام کہیں نہیں لیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مولوی الہی بخش صاحب بڑا کرمی عظیم آبادی
(ف ۱۳۳۸ھ) کے اردو ترجمے کے ساتھ چھپا ہے۔

ترجمان وہابیہ :- نواب صدیق حسن خاں صاحب (ف ۱۳۰۷ھ)۔ اس میں
جذبات وہابیوں کے متعلق طرح طرح کی دلچسپ باتیں لکھی گئی ہیں۔ جو اصلیت سے دوہری
ابقاء المذاہب بالقاء المحسن :- نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ)
تواریخ عجیب :- (طبع دوم) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری (ف ۱۹۰۵ء)
مصنف سید صاحب کی جماعت سے خالص تعلق رکھتے تھے۔ غالباً انھیں مولانا
ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) سے بیعت تھی۔ سن ۱۲۸۴ھ کے مقدمہ سازش
انبالہ میں ماخوذ ہوئے اور عیس دواہی کی سزا ملی۔ اور جزائر اندمان بھیجے
گئے۔ سن ۱۲۸۴ھ میں لارڈ رپن (۱۸۸۰-۱۸۸۴) کے حکم سے رہا ہوئے۔
والیسی کے بعد یہ کتاب لکھی۔ نام تاریخی ہے (سن ۱۳۰۳ھ) یہ کالا پانی کے
نام سے بھی مشہور ہے۔ اس میں مصنف نے مقدمہ کی روداد اور ابتداء و
آزمائش کی سرگزشت، جہاں تک ممکن ہو سکا ہے، قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔
سوانح احمدی :- (مطبوعہ صوفی کمپنی) مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری۔
اس میں حضرت سید صاحب کے حالات زندگی، جہاد اور تعلیمات کا خلاصہ
درج ہے۔ مشہور خلفاء کا بھی تذکرہ ہے۔ نیز اخیر میں سید صاحب کے مکتوبات
بھی دے دئے گئے ہیں۔ یہ اردو زبان میں سید شہید کی سب سے پہلی مرتب سیرت
ہے۔ تواریخ عجیب کے پانچ سال بعد لکھی گئی۔ تاریخی نام تواریخ عجیب ہے۔

۱۷ مولوی محمد جعفر صاحب نے ایک کتاب تواریخ عجیب بھی لکھی تھی۔ جس میں صرف جزائر
اندمان کے جغرافیہ حالات سے بحث کی گئی تھی۔ راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ (بقیہ صفحہ ۱۷۲ پر)

تذکرہ صادقہ۔ (جلد دوم) مولانا عبد الرحیم صادق پوری (ف ۱۳۴۱ھ)۔
 مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ) کے بھتیجے اور مولانا فرحت حسین (ف ۱۲۷۴ھ)
 کے صاحبزادے اور اخیر ذور میں خاندان صادق پور کے گویہر شب چراغ تھے۔
 ۱۸۶۷ء کے مقدمہ سازش میں ماخوذ ہوئے، چوبیس دوام بعید و دریائے شور سے
 نوازے گئے۔ ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد بھی چالیس برس سے زیادہ
 حیات پائی۔ یہ کتاب نہایت پریشان کن حالات میں لکھی گئی اور الہ آباد میں چھپ
 معلومات بہت قیمتی ہیں، مگر کچھ بے ہوئے۔ جا بجا ایسے اشارات ہیں کہ اچھے
 واقف کار کے سوا کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ راقم کو حسن اتفاق سے صادق پور (عظیم آباد)
 کے ایک صاحب علم کا ذاتی نسخہ مستعار مل گیا، جس میں اکھنوں نے "بین السطری"
 اشارات کی توضیح و تشریح نیز بعض نئے معلومات کا اضافہ کیا تھا۔ اس سے
 بہت مدد ملی اور فاس گرغیروں کے مبالغہ آمیز بیانات کی جانچ پرکھ میں ان
 خواہشی نے بہت کام دیا۔

رسالہ اشاعت السنۃ :- مرتبہ مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۸۶ھ)۔
 افسوس کہ اس رسالے کا مکمل فائل نہیں دستیاب ہو سکا۔ ورنہ مفید معلوماتیں
 ارغمان احباب :- مولانا حکیم سید عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء (ف ۱۳۴۱ھ)

(بقیہ ماضیہ صفحہ ۲۱۳) یہ ایک باخبر صاحب علم کی روایت ہے۔ راونشانے ان کے روزنامہ نصاب
 جعفری کا بھی ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹری کا آغا فخرزادہ مسیح خاں ۱۸۷۸ء کو پڑھنے کے لیے آیا تھا۔
 یعنی مقدمہ انبالہ سے دو برس پہلے۔ اس کتاب کا اور کسی دوسرے ذریعہ سے پتہ نہیں چلا۔

نے اپنے علمی سفر کی روداد قلم بند کی ہے (۱۳۱۲ھ) اس میں جماعت کے متعلق

مفید معلومات ملتے ہیں۔ (معارف: فروری۔ جون ۱۳۹۷ھ)

تذکرہ :- مولانا ابوالکلام آزاد۔

تراجم علمائے حدیث ہند :- ابوبحیسی محمد امام خاں نوشہروی۔

سیرت سید احمد شہید (طبع دوم) مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی۔

انگریزی عہد میں ہندستان کے تمدن کی تاریخ :- عبداللہ یوسف علی۔

ولی اللہ نمبر :- (الفرقان) مرتبہ :- مولانا محمد منظور نعمانی۔

تجدید و احیائے دین :- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک :- مولانا عبید اللہ سنہ ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۱ء)

مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر :- مسعود عالم ندوی۔

محمد بن عبد الوہاب :- ایک مظلوم اور بدنام مصلح :- مسعود عالم ندوی۔

وہابیت :- ایک دینی و سیاسی تحریک (مقالہ) :- مسعود عالم ندوی۔

(الہلال - مئی۔ جون ۱۳۷۷ھ)

شاہ اسماعیل شہید :- (مجموعہ مقالات الادب) مرتبہ :- عبداللہ بٹ۔

انگریزی (۳)

1. **A History of the Sikhs.**
Joseph Davey Cunningham, London, 1849.
2. **Correspondence connected with
Removal of W. Taylor from the
Commissionership of Patna, Calcutta, 1858.**
3. **A General Report on the Yusuizais**
—H. W. Bellow, Lahore, 1864.
4. **Memorandum** by T. E. Ravenshaw
and the judgements of Mr. W. Ainslie,
the session judge, Patna and of the
High Court. (Calcutta Gazette's
Supplement, dated the 20th September
1865)
5. **Nine years on the North West
Frontier of India.**—Sydney Cotton,
London 1868.
6. **The Indian Musalmans**
—W. W. Hunter. نیاڈیشن کلکتہ
The Wahabie Trial at Patna, 1871.
سرکاری رپورٹ سنہ طباعت درج نہیں۔
8. **The Wahabis in India**
—James O'kmealy. (Calcutta Review.
1870—71)
9. **Sir Saiyid on Dr. Hunter's Our Indian
Musalmans.** London, 1872.

10. Notes on Mohammadanism.

T. P. Hughes, London, 1877

11. The History of the Wahabys in Arabia
and in India E. Rehatsek

(J. R. A. S. Bo.) vol. IV, 1880.

12. Thirty-Eight years in India.

—William Taylor, London, 1882.

13. History of the Punjab

Sayyid Mchammad Latif. Calcutta, 1891

14. Bengal under the Lieutenant Governors

—G. E. Backland, Calcutta, 1901

15. Binar Legislative Assembly Proceedings

(the 16th March, 1939)

16. Shah Ismail Shaheed

Abdullah Butt, Lahore, 1943.

17. Encyclopaedia of Islam :

ملہارٹ Blumhart کا مقالہ احمد

Wahabiyah ; مارگیولیو تھ کا مقالہ

عبد اللہ یوسف علی کا مضمون کرامت علی ہدایت حسین کا مضمون فرافضی -

18. ڈاکٹر شفاعت احمد خا کا مقالہ : Maharaja Ranjit Singh

لیڈر الہ آباد جون ۱۹۳۹ء

19. ڈاکٹر محمود حسین کا مقالہ -

The Politics of the Indian Wahabis.

مارٹنگ نیوز سوسائٹی عید نمبر ۱۹۴۷ء

Indian Muslims - A Political History 1858 -

Ram Gopal - Asia Publishing -

مکتبہ نشاۃ ثانیہ

خاص مطبوعات

محمد بن عبد الوہاب
ایک مظلوم اور بدنام مصلح
از مولانا مسعود عالم ندوی

بارہویں صدی ہجری کے مشہور مصلح

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی کی داستان حیات
اس کتاب میں شیخ کی سیرت اور دعوت پر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے اور
شیخ کے متعلق غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں
مشرق و مغرب کے تمام ماخذ کو پوری طرح کھنگال کر ان پر بے لاگ تنقید بھی
کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (۸/۰۰)

مکتبہ نشاۃ ثانیہ

ہندستان کی پہلی اسلامی تحریک

از مولانا مسعود عالم ندوی

حضرت سید شہیدؒ اور ان کے ماننے والوں کی چلائی ہوئی تحریک تجدید و
جہاد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ نیز سید شہیدؒ کے کارناموں پر بے لاگ تبصرہ و تنقید
کرتے ہوئے غیروں کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشان دہی اور تردید بھی
کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (۸)

علماء اور اسلام

از مولانا محمد منظر الدین صدیقی۔ بی۔ اے

موجودہ دور میں اسلام کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ کار کیا ہونا چاہیے اور اس کے
مقابلہ میں آج کے علماء کرام کیا کر رہے ہیں اس عنوان پر ایک بصیرت افروز
مقالہ ہے۔ آخر میں علماء کو صحیح مشورہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت چودہ آنہ (۱۴)

اپنی باتیں۔ سچی باتیں۔ از مولوی عبدالقدیر حبیب پوری

قیمت ۹

قیمت ۸

بچوں کو اسلام کے اصول و عقائد دلچسپ بچکانہ انداز میں سمجھائے گئے ہیں۔

دکتابہ نشاۃ ثانیہ

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں

از سید اصغر علی عابدی

اشتراکیت کی نظام حیات کی پہلی تجربہ گاہ روس میں آہنی پردوں کے پیچھے جو کچھ چھو رہا ہے، اس کو اخلاقی، سیاسی اور معاشی تمام پہلوؤں کے ساتھ بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اشتراکیت کے دلدادوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ کتاب مجلد معہ رنگین گروپش ہے۔ قیمت تین روپیہ (سے ۳)

ابلیس کا روزنامہ { از نعیم صدیقی

پاکستانی تحریک اسلامی کے مشہور اہل قلم ابو السلام نعیم صدیقی نے انسانی سماج پر ابلیس کے مفدانہ حملوں کا حال دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ کس طرح ابلیس سماج کے افراد کو اپنا ایجنٹ بنالیا کرتا ہے۔ تعمیری ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے خاص چیز ہے۔ قیمت آٹھ آنہ (۸ ر)

اسلامی انقلاب کی راہ { از ابو الازہر فاضل عمری

اسلامی انقلاب کا راستہ کن سنگلاخ راہوں سے گزرتا ہے اور اس راہ میں کیا کچھ کٹھن منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں، فاضل عمری کے اس مختصر مقالہ میں پڑھیے۔ قیمت ۸ ر

مکتبہ شامیہ

میرا نام ہے تعلیم

از نعیم صدیقی

خام انسانی مواد کو ڈھال کر اپنے مطلب کے انسان تیار کرنے کے کام کا نام آج تعلیم ہے۔ اہلیس کے فرنگی ایجنٹوں نے ہندوستان میں تعلیم کو کس طرح اپنا حربہ بنایا، نعیم صدیقی نے اپنے اس ڈرامہ میں اس کو پیش کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

قیمت چھ آنہ (۶)

اسلام کا سیاسی نظریہ و فلاح عالم

از مولانا محمد اسحاق سندیلوی

دور جدید نے متعدد سیاسی نظریے جنم دیئے ہیں جنہیں اندھے کے تیروں کی طرح یکے بعد دیگرے آزمایا جاتا رہا ہے اور آج تک کوئی بھی اپنے نشانہ پر نہیں بیٹھ سکا ہے۔ اس حقیقت کو مولانا نے اپنے مقالہ میں خوب اہم شرح کیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کی فلاح اسلام اور صرف اسلام کے سیاسی نظریے کو اپنانے میں ہے۔

قیمت آٹھ آنہ (۸)

مکتبہ نشاۃ ثانیہ

تصویر (علم و عقل کی روشنی میں)

از مولانا محمد اسحاق سندیلوی

مسئلہ تصویر کشی پر علمائے آیات و احادیث کی روشنی میں بڑی اختلافی بحثیں کی ہیں۔ لیکن مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے اس مسئلہ کو علم و عقل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور سجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس راستہ سے منشاء شریعت کو پانے میں مولانا بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ آخر میں محترم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک توضیحی نوٹ بھی شامل ہے جو اس مسئلہ کی صحیح حیثیت پر آخری مہر ثبت کر دیتا ہے۔ قیمت چھ آنہ۔ (۶)

تصریحات

از مولانا مظہر الدین صدیقی - بی۔ اے

یہ متفرق سیاسی، مذہبی و سماجی عنوانات پر معلومات آفریں اور پُر مغز مقالوں کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔

مجلد مع رنگین گروپشس - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (۸)

(مکتبہ نشاۃ ثانیہ)

مارکسنرم آرا اسلام (زبان انگریزی)

از مولانا محمد منظر الدین صدیقی۔ بی۔ اے

مارکسنرم اور اسلام پر بہت سے اصحاب فکر نے قلم اٹھایا ہے لیکن منظر صدیقی صاحب کو اس عنوان پر لکھنے میں جو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ بہت کم اہل قلم نے اس کا حصہ پایا ہے۔ یہ منظر صاحب کا خاص موضوع ہے۔ وہ مارکسنرم کا تجزیہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اس کی پوری تصویر اپنے تمام محاسن و معائب کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مارکسی فلسفہ اشتراکیت کی پوری طرح بے نقاب کر کے دکھایا ہے۔

مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ قیمت پانچ روپیہ (۵ رو)

ملنے کا پتہ :-

(۱) مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظّم جم جاری مار حید آباد دکن

(۲) مکتبہ الحسنات راجپور۔ یو۔ پی

کتابخانہ / محمد ہادی

